نہایت ضروری اعلان

گزشتہ جنوری سے اڈیٹر کے قلم کی دو کتابیں مسلسل نگار میں شائع ہو رہی ہیں۔ ایک "اسلامی ہند کی تاریخ" جو تاریخی حیثیت سے بے مثل چیز ہے اور دوسری "نغمۂ کارواں" جو اپنی ادبیت کے لحاظ سے خاص مرتبہ رکھتی ہے۔

جو حضرات شروع سال (یعنی جنوری ۱۹۳۸ء) سے رسالہ کے خریدار نہیں ہیں، ان کے لئے اب بھی وقت ہے کہ وہ جنوری سے اسوقت تک کے تمام مسلسل پرچے طلب کر کے شروع سال سے اپنی خریداری محسوب کریں، ورنہ پھر بعد کو یہ دونوں کتابیں کسی قیمت پر بھی انھیں نہیں مل سکتیں۔

مینیجر نگار لکھنؤ

جلد (۳۴)	فہرست مضامین اگست ۱۹۳۸ء	شمار (۲)

ملاحظات ---------- ۲

مسئلۂ خلافت و امامت ---------- ڈاکٹر حسین ---------- ۹

غالب پھر اس دنیا میں ---------- فراق گورکھپوری ---------- ۲۷

ریاستوں کے مطالبات آزادی ---------- ۳۳

اردو ادب اور مقالہ نگاری ---------- افضل ---------- ۳۷

سیاسیات یورپ ---------- ۴۲

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری ---------- فضل حسین تبسم ---------- ۴۶

مکتوبات نیاز ---------- ۵۷

باب الاستفسار ---------- ۶۱

مطبوعات موصول ---------- ۶۲

منظومات ---------- فضل الدین اثر - سیماب اکبرآبادی ---------- ۶۳

اسلامی ہند ---------- ۱۹۹

نغمۂ کارواں ---------- ۲۹

اعلیٰ بیرونی اقوام (تمباکو، خودرو قیمتی تولہ ۱۴ء) جو قطعاً نزلہ نہیں پیدا کرتا۔ شیخ خورشید علی پرفیومر نظیر آباد لکھنؤ کے پتہ سے مل سکتا ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد-۳۴	اگست سنہ ۳۸ء	شمار-۲

ملاحظات

کانگرسی وزارتوں کی ناکامیاں

اس میں شک نہیں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ حکومت کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ملک کے احساس کو کسی حکومت نے نظر انداز کر دیا ہو اور وہ زیادہ عرصہ تک قایم رہ سکی ہو۔ چنگیز و ہلاکو، نیرو اور کالیگولا کی حکومتوں کا ذکر نہیں، بنو امیہ و بنو عباس کو دیکھئے کہ علویین کی جماعت ان کے مقابلہ میں کیا تھی لیکن پھر بھی اس نے شیرازۂ حکومت منتشر کر ہی دیا۔ نہ اقلیت و اکثریت کی جنگ کوئی نئی چیز ہے اور نہ بڑی بڑی سلطنتوں کا ذرا سی غلطی سے تباہ ہو جانا کوئی نیا واقعہ لیکن اسباب و نتائج پر غور کرنے والوں کے لئے یہ بات ضرور حیرت میں ڈالدینے والی ہے کہ ایک حکمراں جماعت اعتماد پیدا کرنے سے قبل ہی اپنا اعتماد کھو بیٹھے۔ پھر اور صوبوں کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن یوپی کی حکومت کی نسبت ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس نے یہی حیرت میں ڈالدینے والی حرکت کی ہے اور بجائے سنبھلنے کے اسکی حالت روز بروز بگڑتی ہی جا رہی ہے

اول اول جب کانگرسی وزراء نے عنان حکومت ہاتھ میں لی تو اہل صوبہ کی بڑھی ہوئی توقعات کا یہ عالم تھا کہ ہر متنفس

بلاتفریق نسل و قوم یہی یقین رکھتا تھا کہ حکومت اب اُسی کی ہے اور اس کے عجز و درماندگی کا زمانہ گزر گیا ہے، لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے یہ یقین شک میں تبدیل ہوتا رہا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جس چیز کو ہم نے سونا سمجھا تھا وہ صرف ملمع تھا اور جس کیفیت کو ہم نے خلوص و صداقت سے تعبیر کیا تھا اس کا تعلق دل سے نہیں بلکہ صرف زبان سے تھا

کانگریس کی بین الاقوامی اہمیت کا راز صرف یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی جماعتوں کی نمائندہ تھی۔ اس کی یہی مرکزیت تھی جس کے توڑنے کی ہمیشہ کوشش کی گئی اور اس کا یہی متحدہ محاذ تھا جس نے اتنی کامیابی حاصل کی پھر اب کہ کانگریس رفتہ رفتہ اپنی اس خصوصیت کو کھوتی جا رہی ہے کیا وہ صرف اکثریت کی نمائندہ ہو کر اپنی اس اہمیت کو باقی رکھ سکتی ہے یہ وہ سوال ہے جو اکثریت نہیں بلکہ اقلیت کے زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کے قابل ہے، کرسی وزارت پر نہیں بلکہ اس سے نیچے اُتر کر دیکھے جانے کا مستحق ہے

یو۔پی کی حکومت محکمۂ جات میں بداخلاقی و بددیانتی کے انسداد کے لئے ایک افسر کا تعین تو کرتی ہے، لیکن خود اپنے تئیں بھول جاتی ہے، حالانکہ سب سے پہلے اسے اپنی ہی نیت کا احتساب کرنا چاہئے اور اقلیت کے دل سے یہ اندیشہ دور کر دینا چاہئے کہ "انسدادِ بددیانتی" کے بہانہ سے جس گمشدہ انصاف و دیانت کی جستجو کی جا رہی ہے اس کا مقصود کہیں اقلیت ہی کی جانِ ناتواں کا خون کرنا تو نہیں ہے

میں اس سے قبل کی اشاعتوں میں بھی ظاہر کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ نہ دفتری کارروائی کوئی چیز ہے نہ محکمۂ جات کے اعداد و شمار بلکہ اصل چیز حقیقی معنے میں اعتماد پیدا کرنا ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک ہندو جماعت کے اکابر اپنی نیت میں خلوص و صداقت اور اخلاق میں بلندی پیدا نہ کریں

یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر تمام ملازمتیں بجائے ہندوؤں کے مسلمانوں کو دیدی جائیں، تو بھی مسلمانوں کی اقتصادی دشواریاں دور نہیں ہو سکتیں اور نہ کوئی قوم محض نوکری کی بناء پر ترقی کر سکتی ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ جو چند افراد اس ذریعہ سے فایدہ اُٹھا سکتے ہیں ان کو بھی اس سے محروم کر دیا جائے، بلکہ اس کا اقتضاء یہ ہونا چاہئے کہ تناسب آبادی کے سوال کو قطع نظر کر کے زیادہ سے زیادہ جو کچھ ان کی حالت سنبھالنے کے لئے کیا جا سکتا ہے، کیا جائے ۔ تناسب آبادی کے لحاظ سے حصہ کی تقسیم میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ حکومت کو زندگی کا ایک معیار مقرر کر کے صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ملک میں کونسی قوم اس معیار سے گری ہوئی ہے، اور پھر ہر تدبیر سے اُسے اس معیار تک لانے کی کوشش کرنا چاہئے لیکن حکومت کے اس معیار کی توقع ہم کانگرسی وزارت سے کیا کر سکتے ہیں، جبکہ بقالانہ تقسیم کے لحاظ سے بھی وہ ڈنڈی مارنے سے باز نہیں آتی

حال ہی میں سینٹری انسپکٹری کے درجہ کے لئے ۴۰ امیدواروں کی ضرورت تھی اور تناسب آبادی کے لحاظ سے

۱۲ جگہیں مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں، لیکن اخیر وقت میں وزیر متعلقہ نے امیدواروں کی فہرست میں بیس نام ہندوؤں کے اور اضافہ کر دئے۔ ڈائرکٹر پبلک ہیلتھ نے جو اتفاق سے مسلمان ہیں، وزیر متعلقہ سے کہا کہ تیرہ نام مسلمانوں کے تو نکل نہیں سکتے اس لئے ان کو علٰحدہ رکھ کر اب آپ ہی ۷ ہندوؤں کا انتخاب کر کے باقی ۲۰ نام کاٹ دیجئے۔ یہ سنکر وزیر متلقہ نے جس برہمی کا اظہار کیا وہ ہر چند خلوت کی بات ہے، لیکن اتنا ظاہر کر دینے میں کوئی مضایقہ نہیں کہ انکی تکلیف کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے نزدیک ڈائرکٹر کی گفتگو فرقہ وارانہ کیفیت رکھتی تھی اور یہی وہ چیز ہے جسے کانگرس کی اتحاد پسند، اور منصف مزاج وزارت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ پھر اب کون ہے جو آنریبل وزیر صحتِ عامہ سے پوچھ سکے کہ کیا بیس ہندوؤں کے ناموں کا اضافہ کرنا فرقہ وارانہ جذبہ سے علٰحدہ کوئی چیز تھا اور کیا اتحاد پسندی و انصاف کا تقاضہ یہ نہ تھا کہ ان ناموں کے ساتھ چند مسلمانوں کا بھی اور اضافہ کر دیا جاتا اور کیا مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب نہ تھا کہ تناسب آبادی کے سوال کو قطع نظر کر کے مسلمان بجائے تیرہ کے چودہ لے لئے جاتے؟

اس سے مقصود کسی خاص واقعہ کی طرف ملک کو متوجہ کرنا نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا مدنظر ہے کہ ارباب کانگرس کی یہ ذہنیت کیا ہوتی جا رہی ہے اور اس ذہنیت کے ہوتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کی توقع کیونکر ممکن ہے

زبان اور رسم خط کے متعلق میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اب پھر وہی بات زبان پر آتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی خلیج جس چیز نے حایل کر دی ہے وہ ہندی اُردو کا جھگڑا ہے۔ حیرت ہے کہ پنڈت جواہر لال ایسا شخص اس مسئلہ کو درجۂ دوم کا مسئلہ قرار دیتا ہے اور اس کے خطرناک نتائج کی طرف سے آنکھ بند کئے ہوئے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کانگرس کا فیصلہ اس باب میں بہت مناسب ہے اور ملک میں ایک مشترک زبان پیدا کرنے کی صورت وہی ہو سکتی ہے جو اس نے بتائی ہے، لیکن کیا کانگرس کا فرض صرف اسی جگہ ختم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک رزولیوشن پاس کر دے یا کوئی تجویز پیش کر کے خاموش ہو جائے۔ میری رائے میں اس کو دیکھنا چاہئے کہ اس کی تجاویز پر عمل بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ شمالی ہند، ہندوستان کا وہ حصہ ہے جہاں نہ صرف ہندوستانی بلکہ نہایت فصیح و بلیغ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے یہاں تک کہ تمام معزز ہندو گھرانوں میں عام طور پر وہی زبان استعمال کی جاتی ہے جس میں ہمارے عزیز دوست پنڈت اندرائن ملا شاعری کرتے ہیں، لیکن اگر مولانا ابوالکلام (جو کانگرس پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ہیں اور جن کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ کانگرسی نقطۂ نظر سے وزارتوں کا احتساب کریں) تکلیف فرما کر ایک بار یہاں کی کونسل میں شریک ہوں اور اُن تقریروں کو سُنیں جو ہندو ممبران اور ہندو وزراء کی زبان سے ادا ہوتی ہیں، تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ضبط نہ کر سکیں گے اور بے اختیار فارسی یا عربی میں تقریر کرنے کھڑے ہو جائیں گے

یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں، بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے اور مسلمان تو مسلمان ہندو پبلک بھی پچاس فی صدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے

پھر یہ بدعت کونسل ہال اور دفاتر وزارت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اثر عام ہوتا جارہا ہے چنانچہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائیاں بھی اب زیادہ تر اسی زبان، اسی رسم خط میں قلمبند کی جاتی ہیں اور مسلمانوں کی دلچسپی کو ہر ہر شعبہ سے کم کیا جارہا ہے۔ یہاں کی ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی سے بعض مسلمان صرف اس لئے استعفا دینے پر مجبور ہوئے کہ دفتر کانگریس سے جو اطلاع اور جو اعلان شایع ہوتا ہے وہ ہندی میں ہوتا ہے درآنحالیکہ لکھنؤ کا ہر ہندو اُردو زبان اور اُردو رسم خط سے واقف ہے اور اگر کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ اُردو ہندی دونوں زبانوں میں اعلانات شایع کئے جائیں تو کہا جاتا ہے کہ اس میں مصارف زیادہ ہیں، اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ جسوقت سوال کسی اقتصادی یا سیاسی مصلحت کا آئے گا تو سب سے پہلے اس چیز کو محو کیا جائے گا جو مسلمانوں کی قومی کلچر کی سب سے بڑی امانت دار ہے

یہ وہ تدابیر ہیں جو منظم طور پر کھلم کھلا ہر جگہ مسلمانوں کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے اختیار کی جارہی ہیں اور اسی کے ساتھ عام اخلاقی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے، ان کی تفصیل کے لئے تو ایک دفتر چاہئے۔ یو۔پی کے وزیر تعلیم جو سوشلسٹ جماعت کے تنہا نمایندہ ہیں اور جن کو سب سے زیادہ آزاد خیال ہونا چاہئے۔ ان کے اخلاق کا فسانہ بھی سُن لیجئے۔ ایک مسلمان ٹیچر جس نے اُردو زبان سیکھنے کا کوئی آسان طریقہ ایجاد کیا ہے، ان سے ملنا چاہتا ہے اور وقت مقرر ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ تاریخ موعودہ پر دولتکدۂ وزارت پر پہونچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دیرہ دون تشریف لے گئے ہیں اور وہیں یاد فرمایا ہے۔ یہ غریب جس کی تنخواہ اس کی ضروریات زندگی کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی، کسی نہ کسی طرح دیرہ دون پہونچتا ہے، لیکن وہاں پہونچکر یہ خبر سنتا ہے کہ حضور پھر لکھنؤ واپس تشریف لے گئے اور اسے وہیں حاضر ہونا چاہئے، یہ لکھنؤ واپس آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیض آباد میں تشریف فرما ہیں!۔ معلوم نہیں اس فرار و تعاقب کا نتیجہ کیا ہوا، لیکن خیال یہی ہے کہ وہ غریب تھک کر بیٹھ رہا ہوگا۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان کے بجائے کوئی ہندو ہوتا تو اس کے ساتھ بھی یہی صبر آزما سلوک کیا جاتا، لیکن کیا اس صورت میں جبکہ سوال ہندو وزیر تعلیم اور مسلمان ٹیچر کا ہے قدرتاً مسلمانوں کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ تعزیر دواد و رش محض اس لئے تھی کہ وہ ہندو نہ تھا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا ایک وزیر جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مرد بھی ہے، وعدے کر کر کے ٹال جانا اور کسی حرماں نصیب کو یوں ستانا، کیا کوئی بڑی شاعرانہ بات ہے!

اس قول و فعل کا اختلاف اور اس ظاہر و باطن کے تضاد کا فسانہ کہاں تک کوئی بیان کر سکتا ہے۔ وہی رکن کانگریس ہے کہ وزیر ہونے سے قبل اپنے مکان پر عہد قدیم کی سادگی کا مجسمہ نظر آتا ہے لیکن عنان وزارت ہاتھ میں لینے کے بعد وہ رہنے کے لئے شہر کی بڑی سی بڑی کوٹھی کا انتخاب کرتا ہے، سواری کے لئے بیش قیمت موٹر اس کے لئے خریدا جاتا ہے اور شان وزارت قایم رکھنے کے لئے قوم کے روپیہ سے تمام اُن بیدردانہ مصارف کو جو اس کے ماہوار مشاہرہ سے سہ چند اور چہار چند زیادہ ہوتے ہیں، گوارا کر لئے جاتے ہیں

درانحالیکہ جس حد تک کلچر کا تعلق ہے، عہدۂ وزارت نہ ٹوپی اور دھوتی میں کسی اُجلے پن کا اضافہ کرسکتا ہے اور نہ اُن آلودہ پتوں اور ٹوٹے گندے گلھڑوں میں کوئی کمی، جن پر کونسل چیمبر کے گوشوں میں ہر وقت مکھیاں بھنکتی نظر آتی ہیں، جن صوبوں میں کانگرسی وزارت قایم ہے وہاں اقتصادی دشواریوں کے دور کرنے اور کاشتکاروں کے اُبھارنے کے لئے جو کچھ بھی ہوا ہو، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہندو مسلم اختلافات زیادہ پیدا ہوگئے ہیں اور اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہندوؤں کی مہاسبھائی ذہنیت زیادہ قوی ہوتی جارہی ہے چنانچہ دیکھئے صوبۂ بہار میں ذبیحۂ گاؤ روکنے کے متعلق کیا کیا اہتمامات ہورہے ہیں اور خود یوپی کے بعض دیہات میں ہندوؤں نے کس زیادتی سے کام لیا

میرا مقصود اس سے نہ کانگرس کی مخالفت ہے اور نہ اس کے اُصول سے انحراف، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ لوگ جو آج کل کانگرس کے روح ورواں بنے ہوئے ہیں وہ حقیقتاً کس ذہنیت کے انسان ہیں اور یہ کہ ان کی تنگ نظری کو دیکھتے ہوئے قطعاً کوئی امید نہیں کہ مسلمانوں میں شرکت کانگرس کا ولولہ پیدا ہوسکے، یہ میں نے اس بات کو سامنے رکھ کر کہا کہ ہندو جماعت مسلمانوں کو شرکتِ کانگرس کی دعوت دے رہی ہے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ کہاں کی دعوت اور کیسی اجازت۔ اگر کانگرس کا مقصود واقعی ملک کو آزاد کرانا ہے تو ایک مسلمان کا فطری حق ہے کہ اس کو اپنی چیز سمجھے اور اگر ہندو اس سے کم پر سودا کرنے کے لئے طیار ہیں تو ان کو کانگرس سے علٰحدہ کردے

ہندوؤں میں سوشلسٹ جماعت ہی ایک ایسی جماعت تھی جس سے ہمیں خستگی کی داد پانے کی کچھ توقع ہوسکتی تھی، لیکن گاندھی جی کی ڈکٹیٹرشپ نے اس کو بھی معطل کردیا ہے، یہاں تک کہ جواہر لال ایسا زبردست اشتراکی بھی اسی نیچی سطح پر اُتر آیا ہے جس سے زیادہ بلندی پر ایک غیر اشتراکی ہندو جا ہی نہیں سکتا۔ پھر جس طرح اسوقت مسلمانوں کے سامنے ان کے تحفظ کا مسئلہ ہے، اسی طرح ہندوؤں کے لئے ایک سخت گتھی یہ موجود ہے کہ آیا مسلمانوں سے علٰحدہ ہوکر وہ اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں اور اگر نہیں تو پھر ان دونوں کے اتحاد کی کیا صورت ہے

نواب سر اکبر حیدری اور ہندو مسلم اتحاد

اس میں کلام نہیں کہ ان دونوں جماعتوں کے ذی فہم افراد یہی چاہتے ہیں کہ باہمد گر صلح وآشتی کی صورت پیدا ہوجائے، لیکن اسوقت تک کوئی یقینی تدبیر کسی کے ذہن میں نہیں آئی۔ نواب سر اکبر حیدری نے، جامعۂ ڈھاکہ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں اپنا فاضلانہ خطبۂ صدارت دیتے وقت اس مسئلہ پر بھی نہایت مدبرانہ تبصرہ فرمایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو تدابیر موصوف نے بتائی ہیں وہ پوری توجہ کی مستحق ہیں۔ آپ نے پہلی تدبیر تو یہ بتائی ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کو فرقہ وارانہ تحریکیں قطعاً بند کردینا چاہئے، اسی کے ساتھ دوسری تدبیر یہ پیش کی ہے کہ "دونوں فریق کو اپنے اپنے تاریخی لٹریچر سے نفرت پیدا کرنے والے حصے الگ کردینا" اور سب سے آخری لیکن سب سے زیادہ اہم ومفید تدبیر یہ بتائی ہے کہ "مذہب کا مفہوم سمجھنے کی کوشش صرف تصوف وروحانیات کی وساطت سے کرنا چاہئے اور ظواہر ومراسم کو مذہب نہ سمجھنا چاہئے"

ان تینوں تدبیروں میں پہلی اور تیسری تدبیر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ پہلی تدبیر پر اسوقت تک عمل ممکن نہیں، جب تک تیسری متعین نہ ہو جائے

فرقہ وارانہ تحریکوں کا ذمہ دار صرف مذہب ہے اور چونکہ مذہب نام رہگیا ہے صرف گائے کا گوشت کھانے یا نہ کھانے کا دھوتی پہننے یا نہ پہننے کا، سر پہ چوٹی رکھنے یا نہ رکھنے کا، اس لئے ناممکن ہے کہ ہندو مسلمان کو گائے کا گوشت کھانے کی وجہ سے ملیچھ نہ سمجھے اور ایک مسلمان، ہندو کو اس کی دھوتی اور چوٹی کی وجہ سے اسے کافر نہ کہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ کلچر کے اختلاف کو دین کا اختلاف سمجھ لیا گیا ہے اور دونوں فریق کے مذہبی پیشوا اسی اختلاف کو سامنے رکھ کر آپس میں جذبۂ منافرت پیدا کرتے رہتے ہیں، اس لئے نواب سر اکبر حیدری کی بتائی ہوئی تدبیروں پر تو اسی وقت عمل ہو سکتا ہے، جب سب سے پہلے مولویوں اور پنڈتوں کو سوسائٹی سے علٰحدہ کر دیا جائے اگر انھیں ہم ملک سے باہر نہیں نکال سکتے اور چونکہ یہ اسوقت تک ممکن نہیں جب تک ملک میں تعلیم عام ہو کر خود پبلک کو اس جماعت سے نفرت نہ ہو جائے، اس لئے فوری تدبیر ہندو مسلم اختلاف دور کرنے کی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ کانگرس اپنے کھوئے ہوئے اعتماد کو قایم کرے اور واقعی خلوص و رواداری سے کام لیکر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو تسلیم کرے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہندو اس پر کبھی طیار نہ ہوں گے اور یہ جھگڑا کبھی ختم نہ ہوگا

کانگرسی وزارت کی وہ ذہنیت جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں ہر جگہ یکساں ہے، چنانچہ صوبۂ متوسط و برار کو دیکھئے کہ وہاں کے وزراء تو باوجود کانگرسی ہونے کے کھلم کھلا مہاسبھائی ہیں جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جسوقت مسٹر ساورکر (جنھیں مہاسبھائیوں میں وہی خصوصیت حاصل ہے جو سانپوں میں کالے ناگ کو) ناگپور پہونچتے ہیں تو تمام ارکان وزارت اس طرف ڈھل پڑتے ہیں اور جلسہ میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ہندو راج کی اسکیم کو سامنے رکھ کر ہونا چاہئے وہاں کی وزارت مدرسہ یا اسکول کو اب "ودیامندر" کہنا پسند کرتی ہے۔ سی۔ پی یا صوبۂ متوسط کے بجائے "مہاکوشل" کا نام تجویز کرتی ہے، برار کا لفظ بھی ان کو گوارا نہیں اور یہ تحریک کہ آیندہ تعلیم بالکل ہندی زبان کے ذریعہ سے دیجائے اس میں تو خیر تمام کانگرسی صوبے شامل ہیں

سی پی وزارت کی طرف سے کچھ عرصہ ہوا ایک بیان شایع ہوا تھا کہ مسلمان طلبہ اور طالبات کو کتنے وظایف وہاں کی حکومت نے دئے ہیں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے بھی اس پروپاگنڈا میں کافی حصہ لیا تھا۔ حالانکہ ان میں ایک وظیفہ بھی ایسا نہیں جو کانگرسی حکومت کی یادگار ہو، اور کوئی مدرسہ ایسا نہیں جو مسلمانوں کے لئے اس نے جاری کیا ہو، بلکہ ضلع بیتول کا واحد اردو مدرسہ بھی ختم کر دیا گیا۔ سی۔ پی میں اس وقت امدادی مدارس کو تین لاکھ سے زیادہ کی مدد دیجا رہی ہے لیکن اردو مدارس کا حصہ اس میں صرف ۲۵ ہزار ہے

سرکاری مدارس سوائے ایک دو کے سب ہندی اور مرہٹی کے طلبہ کے لئے مخصوص ہیں، یہاں تک کہ

جبلپور اور ناگپور ایسے مرکزی مقامات کے سرکاری مدارس میں بھی جہاں مسلمانوں کی تعداد کافی ہے، اُردو کا نام و نشان نہیں پایا جاتا

جسوقت مسٹر جینا نے اُردو زبان کے متعلق اپنا بیان شایع کیا، تو مولانا ابوالکلام آزاد نے سختی سے اسکی تردید کی تھی اور کانگرس کے حسنِ نیت کی تائید، لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے حسنِ ظن کے اسباب و دلائل آج تک ہمکو معلوم نہ ہوسکے۔ خود مہاتما گاندھی کو دیکھئے کہ وہ کس زبان میں تقریر کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مولانا کے وجدان کو مطمئن کرنے والی ہو، لیکن اور تمام مسلمانوں کے نزدیک وہ اسی قسم کی ہندوستانی ہے، جو پنڈت مالاجی اور مہاشے پرمانند ہی کی زبان سے اچھی معلوم ہوتی ہے — قہر تو یہ ہے کہ وہ زبان کے مسئلہ کو نہایت معمولی مسئلہ بتاتے ہیں، حالانکہ ہندو مسلم نزاع کا اصل سبب یہی مسئلہ ہے اور اسی نے مسلمانوں کو باور کرایا ہے کہ ہندو ملک کی آزادی کو اتنا عزیز نہیں سمجھتے جتنا ہندی کے رواج کو، کیونکہ ان کا اصل مقصود (یعنی آریہ ورت سے مسلمانوں کے وجود کو محو کرنا) اسی طرح حاصل ہوسکتا ہے کہ پہلے مسلمانوں کے اس لٹریچر کو تباہ کیا جائے جو ان کے کلچر کا حامل ہے اور اس کے بعد پھر اس قوم کا مٹا دینا کیا مشکل ہے جو اپنے کلچر کو برباد کر چکی ہے

پھر جب حالات یہ ہیں تو مسلمانوں کو غور کرنا چاہئے کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے تو کوئی توقع پیدا کرنا بیکار ہے۔ وہ اس بات پر تو لڑ سکتی ہے کہ کانگرسی جھنڈے میں سبز رنگ جو مسلمانوں کا رنگ ہے نیچے کیوں رکھا گیا، فلاں عمارت پر مسلم لیگ کا جھنڈا کیوں نہ نصب کیا گیا، بندے ماترم کے ساتھ مسلم لیگ کا ترانہ کیوں نہ پڑھا گیا، لیکن کسی ٹھوس تعمیری اُصول پر کام کرکے کوئی انقلابی تحریک پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں

اگر مسلمانوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اجتماعی حیثیت سے کانگرس میں شریک ہوکر ہندوؤں کے زور کو نہیں توڑ سکتے تو پھر ان کے لئے چارۂ کار سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ بالکل اشتراکیت کے اُصول پر اپنی جماعت کی تنظیم کریں اور قربانی کے لئے طیار ہوکر باہر نکل پڑیں

جینا اینڈ کمپنی سوائے اس کے کچھ نہیں کرسکتی کہ وہ مطالبات کی فہرست بناتی رہے، وہ اس سے زیادہ کی ہمت کرکے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا پسند نہیں کرسکتی، اس لئے مسلمانوں کو ان کا دامن چھوڑ دینا چاہئے اور ہر متنفس کو اپنی مدد کے لئے خود کمربستہ ہوجانا چاہئے

شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مرد شو، مردانہ پند ناصحاں را گوش گیر

مسئلۂ خلافت و امامت

(مسلسل)

فاضل مضمون نگار کے قلم سے تحریف قرآن کے متعلق شیعوں پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اب میں اس کی تحقیق پر توجہ کرتا ہوں۔

ان کا قیاس ہے کہ شیعہ حضرات جب قرآن سے عقیدہ خلافت الٰہیہ ثابت نہ کر سکے تو تحریف قرآن کی آڑ پکڑی اور شیعی مجتہدین نے اپنے مشکک مریدوں کو یہ کہکر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ سنیوں نے وہ آیات حذف کر دیں جن میں بالتصریح امامت کے متعلق احکام مذکور تھے

لیکن فاضل مضمون نگار نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ عام طور پر شیعہ تحریف قرآن کے قایل نہیں ہیں (شکریہ) پھر جب شیعوں کی عمومی حالت معلوم ہو گئی تو تحریف قرآن کا ذکر نہ جانے کس قسم کی منطق ہے

طبعاً سوال ہوتا ہے کہ شیعوں میں تو روایات تحریف کی بناء پر مشکک مریدوں کو تسلی دی گئی لیکن کتب سنیہ میں جو ان کا طوار پایا جاتا ہے اس کا سبب کیا ہے۔ کبھی اس طرف توجہ فرمائی گئی ہے۔ ہاں میں عرض کرتا ہوں

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جامعین قرآن نے اس ترتیب کو باقی نہیں رکھا جو ہونی چاہئے تھی۔ پھر جن جن ترکیبوں سے قرآن جمع ہوا ہے وہ ترکیبیں بھی سامنے موجود ہیں۔ عہد ثالث میں جو قرآن جلائے گئے وہ تاریخ کے ایک معمولی متعلم سے بھی مخفی نہیں ان کے جلانے کی اس کے سوا اور کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ قرآن کی اس ترتیب کو پسند نہ کرتے تھے اور موجودہ ترتیب کے حامی تھے۔ پھر میں ارباب عقل سے پوچھتا ہوں کہ ایک آیت کہیں سے اٹھا کر کہیں رکھ دیجائے اور دوسری آیت اس کے مقام میں آجائے۔ کیا اسے "یحرفون الکلم عن مواضعہ" (وہ کلمات کو ان مقام سے تحریف کرتے ہیں) نہیں کہہ سکتے

اب یہ اعتراض باقی ہے کہ "عقیدہ خلافت الٰہیہ قرآن میں بالتصریح مذکور نہیں" میں نہیں سمجھ سکا کہ صراحت سے کیا مراد ہے۔ کیا اس سے یہ مراد ہے کہ علی کا نام صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہوا۔ لیکن ادنیٰ غور سے یہ معمہ حل ہو سکتا ہے کہ دعوت قرآن، صاحب عقل اور صاحب تفکر کے لئے ہے

نام اگر صراحت کے ساتھ ہوتا تو اسی طرح ہو سکتا تھا کہ "اے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ علی ہے" لیکن اس کی کیا ضمانت

کہ لوگ اس قول پر سکوت کر لیتے۔ نہایت آسان امر تھا یہ کہنا کہ "علی" نام نہیں ہے بلکہ خلیفہ کی صفت ہے۔ یعنی اے رسول تیرے بعد تیرا خلیفہ بلند مرتبہ والا ہے۔

تعجب نہ کیجئے۔ حدیث مدینہ مشہور حدیث ہے۔ محدثین اہل سنت اس حدیث کو باب فضائل علوی میں نقل کرتے ہیں۔ مگر آج اس کے معنی نکالے جاتے ہیں کہ "میں شہر علم ہوں جس کا دروازہ بلند ہے"۔

اگر اسم علی اس حیثیت سے درج قرآن ہوتا یقیناً یہی حشر ہوتا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام آئمہ کے نام کھلم کھلا درج کئے جاتے۔ مثلاً "ثم الحسن ثم الحسین"۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ یہ قرآن ہے جسکا نام حکما کی اصطلاح میں عقل اجمالی ہے اور صاحبان عقل وہ ہیں جو اجمال میں تفصیل کا مشاہدہ کرتے ہیں

عام فہم اور سادہ زبان میں یوں سمجھنا چاہئے کہ قرآن کی بنیاد ایجاز و اختصار پر رکھی گئی ہے اور یہی اس کا حسن ہے اگر اس طرح نام درج کئے جاتے تو اچھا خاصہ شجرہ بن جاتا۔ اس ایجاز کی مثالیں قرآن میں کافی موجود ہیں۔ مثلاً خدا نے اصطفائے آل ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ اس میں مختلف صورتیں ہوتی ہیں:۔

(۱) تنہا بنو اسحٰق مراد ہیں ؟ اور پھر ان میں بھی کل یا بعض

(۲) فقط بنو اسمٰعیل مراد ہیں ؟ اور وہ بھی کلاً یا بعضاً ؟

(۳) دونوں مراد ہیں ؟ اور پھر بہ حیثیت کل یا بہ حیثیت بعض ؟

پس ان سوالات کا سمجھنا اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ اسی طرح قرآن نے بیان کر دیا "اہل البیت" اب یہ معلوم کرنا ہمارا فریضہ ہے کہ اہل بیت مطہرین کون ہیں ؟

الغرض تصریح و صراحت کے متعلق جو شکوک پیش کئے جاتے ہیں وہ اہل عقل کے لئے قابل توجہ نہیں ہیں۔ آخر میں ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو ختم کیا جاتا ہے۔ معلوم ہے کہ حضرات اہل سنت نہایت اطمینان سے فتویٰ دیتے ہیں کہ شیعوں کے پاس خلافت الٰہیہ کے لئے کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیعوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے لیکن ان حضرات نے کبھی خلافت اجماعی و شوریٰ پر بھی نظر ڈالی ہے کہ یہ طریقہ خلافت اصول قرآنی کے مطابق ہے یا نہیں۔

اہل سنت کے پاس اس بارے میں بس ایک آیت ہے جس سے وہ تمسک کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی

"وامرھم شوریٰ بینھم"

مشورہ کے بہتر ہونے میں کسی عاقل کو کلام نہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن میں انسان کو مشورے کی ضرورت پڑتی ہے علاوہ ازیں مشورے سے باہمی ارتباط اور تعلقات بھی محکم ہوتے ہیں۔ رسول اللہ سے ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظاً غلیظ القلب لانفضوا من حولک فاعف عنھم واستغفر لھم و شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین" (آل عمران)

(ترجمہ) اس رحمت کے سبب سے جو تیرا حصہ ہے تو ان کے ساتھ نرمی سے پیش آیا۔ اور اگر تو بدخو اور سنگدل ہوتا تو یہ تیرے پاس سے متفرق ہو جاتے۔ پس ان سے درگزر کر۔ ان کے لئے استغفار کر اور ان سے مشورہ کر اور جب تو عزم کر چکا تو اللہ پر توکل کر۔ بالتحقیق کہ اللہ توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

اس سے ظاہر ہے کہ تالیف قلوب کے لئے دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا ان کے لئے استغفار کرنا اور ان سے مشورہ کرنا نہایت مفید چیزیں ہیں۔ علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے۔ "الاستشارۃ یمین الہدایہ وقد خاطر من استغنی برایہ" مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور اپنی رائے پر بھروسہ کرنے والا خطرے میں ہے

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے آیت کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ جب کسی کو کوئی اہم کام درپیش ہو تو وہ ضرور مشورہ کرے کہ عین فلاح یہی ہے۔ میں اس مقام پر صاحبان عقل سلیم سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت سے کیونکر یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ چند انسان اغراض خاص کے ماتحت ایک جگہ ملکر بیٹھیں اور باہر آکر کہدیں کہ ہم نے فلاں شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا

اس تمام بحث کے علاوہ لفظ "امرہم" واقع ہوا ہے یعنی "ان کا امر" اور پہلی بحث تو یہی ہے کہ خلافت الٰہیہ "امر اللہ" ہے یا "امر الناس" اس بحث کو طے کرنے کے بعد اس مسئلہ کو آیت کے زیر سایہ لانے کی کوشش ہو سکتی ہے ورنہ بیکار ہے

خیالات کی نیرنگیاں ہر رنگ میں حیرت افزا ہیں۔ خلافت ثانیہ میں تو مشورہ کو دخل نہیں دیا گیا۔ صرف جانے والے کا حکم تھا۔ دوسرے لفظوں میں ولی عہدی۔ پھر یہاں کیا ہوگا۔ الغرض آیۂ شوریٰ حضرات اہل سنت کے مان لئے ہوئے معنی کو محیط نہیں ہے اور نہ خلافت کی تصویب کے لئے اسے استدلالاً پیش کیا جا سکتا ہے

خلفائے راشدین

یہ وہ بحث ہے جسے لکھ کر بخیال خود دنیائے تشیع پر وہ بار رکھ دیا گیا ہے کہ گویا قیامت تک سبکدوشی نہیں ہو سکتی مگر پہلا سوال اس مسئلہ میں یہ ہے کہ "خلفاء" کے ساتھ "راشدین" کی نسبت کہاں سے آئی۔ خدا سے یا رسول سے؟ یا خود ساختہ؟

اس لفظ پر ایراد کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ خلافت کے متعلق اسلام میں دو ہی نظریے پائے جاتے ہیں یعنی (۱) خلافت من اللہ اور (۲) خلافت من الناس۔ ان میں پہلا عقیدہ تو گویا ہے ہی نہیں۔ لامحالہ دوسرا نظریہ پسندیدہ قرار پائے گا۔ اب اگر کوئی شخص پہلے عقیدے کو چھوڑ دے جو بخیال حضرات موہوم ہے تو دوسرے موہوم میں تو مبتلا نہیں ہوگا وہ صریحاً دیکھے گا کہ جتنے سلاطین معہ خلفاء اسلام میں گزرے ہیں وہ سب انھیں اصول کے تحت میں ہیں جو تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ لہذا کسی کو خلیفہ کہنا اور کسی کو سلطان۔ یہ افتراق بے معنی ہے۔ پھر طرہ یہ کہ کچھ لوگوں کو راشدین سے ملقب کرنا اور کچھ لوگوں کو غیر راشدین قرار دینا بالکل بے ربط ہے۔ اگر خلفاء کہنے میں کوئی خاص بات ہے

تو سب کو خلیفہ کہئے اور راشدین کہنے کو جی چاہتا ہے تو سب کو راشدین کہئے "یک بام و دو ہوا" ایک قسم کا تمسخر ہے
اب رہا یہ امر کہ کسی کی نیکیاں زیادہ ہیں کسی کی کم ہیں۔ ہوا کریں ہمیں کیا؟ اپنی اپنی گور اور اپنا اپنا عمل۔
میں اس کی مزید توسیع کئے دیتا ہوں کہ عنوان کے تحت میں جن حضرات کی سیرت نگاری کی جاتی ہے مطلب صرف یہی ہے نا؟ کہ اس تجلی سے اعتقاد آبائی کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی جائے۔ اسے آزادی خیال نہیں کہتے۔ استدلال کا ایک جھونکا اس ساری تعمیر کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔ ان حضرات کے محاسن لاکھ گنوائے جائیں بہر حال وہ منصوص من اللہ تو نہیں ہیں۔ انسان ہی کے مقرر کردہ ہیں۔ اس لئے لوگوں پر ایمان لانا ضروری نہیں۔
اس مقام میں ایک شیعہ کے نزدیک علی کی بھی کوئی خصوصیت نہیں اس لئے کہ شیعہ جو حضرت علی کو مان رہے ہیں وہ صرف اس لئے کہ منصوص من اللہ ہیں اور جب یہ عقیدہ ہی اڑ گیا تو پھر علی بھی یکے از دیگراں ہیں۔ وہ کسی جماعت میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ یہ ان کا ایک ذاتی فعل ہوگا۔ جو قطعاً کسی کے لئے حجت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ "راشدین" کا ضمیمہ لفظ "خلفاء" کے ساتھ محض ایک خوش اعتقادی ہے
اب میں اس طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ حضرات خلفاء کے ساتھ علی مرتضیٰ کا سلوک ایک شیعہ کی نگاہ میں کیا معنی رکھتا ہے
واضح ہو کہ شیعہ خلافت الٰہیہ کے جس عقیدے کو دل میں جگہ دئے ہوئے ہیں اس عقیدے کی رو سے صرف حضرت علی ہی امام نہیں ہیں بلکہ دوسرے حضرات آئمہ بھی ہیں اور اس عقیدے کی بنا پر ان میں اور حضرت علی میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ ایک دوسرے کے قول و فعل کے شارح ہیں۔ ان دوسرے بزرگواروں نے اپنے زمانے کی حکومتوں کے مقابل صلح و آشتی ہی کو اپنا طریقہ قرار دیا لیکن ان بزرگواروں کے اس صلح و آشتی کو مدنظر رکھتے ہوئے ان حکومتوں کو شیعوں نے کبھی حکومت حقہ تسلیم نہیں کیا اور نہ خود ان بزرگواروں کا کوئی ایسا ارشاد یا ہدایت ہے بلکہ اس کے خلاف ان کے اقوال موجود ہیں۔ آئمہ اہل بیت کا یہ عمل ہمارے نزدیک علی مرتضیٰ کے فعل اور عمل کا شارح ہے جس طرح وقتی مصلحتوں کی بنا پر علی مرتضیٰ نے حکومت وقت کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ گزاری اسی طرح دیگر ائمہ نے بھی۔ پس جس طرح ائمہ کا یہ فعل حکومت وقت کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے اسی طرح علی مرتضیٰ کی مصالحت سے عند الشیعہ حقانیت حکومت وقت پر استدلال نہیں ہو سکتا۔
شیعہ اگر خلافت الٰہیہ کے نظریے کا حامی ہے تو اس کا یہی اصولی جواب ہے جو عرض کیا گیا۔ پھر کیا حق ہے دنیا کو کسی کے معتقدات کو نہ سمجھتے ہوئے اس پر وہ بار رکھے جس کا وہ اصولاً منکر ہے اور اگر شیعہ اس عقیدے سے دست بردار ہو کر اس دائرے سے نکل رہا ہے تو پھر اس کی آزادی خیال کے سامنے امتیازات کی کوئی دیوار حائل نہ ہونی چاہئے۔ کس کے راشدین اور کس کے غیر راشدین!

خوش نباشد جامہ نیمے اطلس و نیمے پلاس

اس بحث میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اگر میں شیعہ حضرات کی مستند احادیث سے اپنے قول کو ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو غالباً میں اپنی ذمہ داری سے باحسن الوجوہ عہدہ برآ ہو جاؤں گا"

خواب نہایت اچھا ہے۔ تعبیر ناظرین کے سامنے آجائے گی۔ میرے کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ بھی اندازہ ہو سکیگا کہ کسی سطحی مناظر کی تصنیف پر اعتماد کر کے حوالے اور عبارتیں لکھ دی گئی ہیں۔ اصل کتاب کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی۔ کتابوں کے نام تک صحیح نہیں ہیں۔ مثلاً لکھا گیا ہے شیعوں کی مشہور کتاب حدیث "کلینی"! میں عرض کروں گا کہ شیعوں کے ہاں اس نام کی کوئی کتاب نہیں ہے۔ البتہ ایک کتاب حدیث "کافی" ہے۔ اس کے مصنف کا نام ہے محمد بن یعقوب کلینی (کلین کے رہنے والے) ایسی دلچسپیاں بہت ہیں۔ ناظرین عنقریب ملاحظہ کریں گے

ہاں اس عنوان "خلفاء راشدین" کے متعلق میں مجملاً کہہ آیا ہوں۔ لیکن ناانصافی ہوگی اگر مندرجۂ ذیل خیال کے متعلق معروضہ نہ کیا جائے

"اگر خلفائے ثلثہ کا زمانہ واقعی غاصبانہ دور خلافت ہوتا تو حضرت علی جیسا جلیل القدر مسلمان اپنی عمر کا بڑا حصہ اس غیر اسلامی زمانے کا ساتھ دینے میں بسر نہ کرتا اور پوری طاقت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کر کے خدا اور رسول کے منشاء کو پورا کرنے کی کوشش کرتا جس کے بعد یا تو وہ اعلاء کلمۃ الحق میں کامیاب ہو کر مسند خلافت پر متمکن ہو جاتے اور یا حسین کی طرح میدان کارزار میں تڑپتے نظر آتے"

صلح و آشتی کی پالیسی کے متعلق تو میں کہہ چکا ہوں اور اس کے متعلق شیعی نمائندہ کا جواب جو درج کیا گیا ہے معقولیت پر مبنی ہے۔ ہاں یہ آخری سطور پر رائے زنی باقی ہے۔

یہ خیال جو آخر میں ظاہر کیا گیا ہے کوئی نیا خیال نہیں ہے بالفاظ مختلفہ اسے ہمیشہ دہرایا گیا ہے اور غالباً جب تک دنیا باقی ہے دُہرایا ہی جائے گا

بہت خوب! علیؓ قتل ہو جائے۔ قتل ہو جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر نتیجہ؟ شہادت حسینؓ سے جو نتیجہ مترتب ہوا وہ علیؓ کے قتل پر ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر فعل کی تاثیر میں زمانے کو بھی بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قتل علیؓ کے معنے یہ تھے کہ حسنینؓ بھی قتل ہو جاتے۔ بلکہ تمام عمائد بنی ہاشم موت کے گھاٹ اُترتے۔ نتیجہ کیا ہوتا؟ صاف ظاہر ہے کہ حکومت بے کھٹکے اغیار کے ہاتھوں میں کھیلتی اور یہی خواہان حکومت کی طرف سے بیرونی دنیا کے لئے جو تاریخی مواد پیش کیا جاتا۔ ظاہر ہے وہ کیسا ہوتا

تاریخی واقعہ ہے کہ مالک ابن نویرہ نے زکوٰۃ بھیجنے میں عذر کیا کہ رسول اللہ نے حکومت وقت کے لئے کوئی وصیت نہیں کی بلکہ وصیت کسی اور کے لئے ہے۔ فوراً فوج بھیجی گئی۔ اس قبیلہ پر کامل بربریت کے ساتھ حملہ کیا گیا۔ بالآخر اس قبیلہ کا نام "مرتدین" کی فہرست میں لکھ دیا گیا۔ کیا قتل ہو جانے کے بعد علیؓ اور دیگر بنو ہاشم کا نام اس فہرست میں نہ آتا

اور کیوں نہ آتا؟ البتہ یہ موقعہ علی نے نہیں دیا

علاوہ ازیں علی کے قتل ہوجانے پر یہ بھی ممکن نہ تھا کہ بنو تیم اور بنو عدی اس حکومت پر رہ سکیں۔ بنو امیہ موقعہ کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوسفیان زندہ تھا۔ بنو ہاشم ہی تھے جن کو وہ اپنی ٹکر کا سمجھتا تھا۔ ان کے بعد میدان صاف تھا باقی بنو تیم اور بنو عدی اس کی ایک دھمکی سے خانہ نشین ہوجاتے۔ ابتدا سے ہی بنو امیہ سریر سلطنت پر آتے اور وہیں سے۔

ولعبت ہاشم بالملک لا
خبر جاء ولا وحی نزل،

کے ترانے بلند ہوجاتے

تاریخ بتاتی ہے کہ جسوقت حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو ابوسفیان نے علی سے آکر کہا کہ اُٹھو۔ مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دوں گا اگر علی اس کے دم میں آجاتے تو عین میدان کارزار میں مخالفین سے ملکر بنو ہاشم کا خاتمہ کرا دیتے اور ان کے بعد پھر دوسرے تھے ہی کیا۔ لیکن علی اس راز سے واقف تھے اس نے جو نقشہ ڈالا تھا اسے سمجھتے تھے۔ لہذا جھڑک دیا اور صاف کہا کہ تو منافق ہے

یہ ہیں وہ اندرونی ریشہ دوانیاں جن پر نظر کرتے ہوئے اہل بصیرت نے ہمیشہ سے کہا ہے کہ اسوقت مدینہ میں جنگ داخلی کا واقع ہوجانا نفس اسلام کے لئے مضر تھا اور ایسا مضر کہ ابتدائے بعثت میں جو نتیجہ حضرت پیغمبر کی شہادت سے نکلتا وہی ابتدائے خلافت میں حضرت علی کے قتل ہوجانے سے برآمد ہوتا

اب اس کے علاوہ فتح یاب ہوکر تخت سلطنت پر متمکن ہوجانے میں علی کی حیثیت بادی النظر میں اسی بادشاہ کی سی ہوتی جو اپنے مخالفین کو تہ تیغ کرکے سریر سلطنت پر قدم رکھا کرتا ہے اسی لئے ارشاد ہوا ہے "فصبرت علی طول المدۃ وشدۃ المحنۃ" اس طویل مدت اور رنج والم کی شدت پر میں نے صبر کیا

حقیقت یہ ہے کہ اغراض ذاتی کا قدم اگر درمیان میں ہوتا تو شاید علی یہی کر گزرتے لیکن وہ اس سطح سے بلند ہیں

این زمیں را آسمانے دیگر است

اب میں ان منقولات پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں جو فاضل مضمون نگار کو خدا جانے کتنی زحمت سے دستیاب ہوئے ہیں:-

(۱) ایک خط کا مضمون رقم کیا گیا جو حضرت علی نے حاکم شام کو جنگ صفین کے دوران میں لکھا ہے۔ اس میں حضرات شیخین کی تمجید کی گئی ہے

"کتاب الفتوح" "ابن عاصم کوفی" اور "شرح نہج البلاغۃ" کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ "ابن عاصم" میرے خیال میں صحیح نہیں بلکہ صحیح لفظ "ابن اعثم" ہے۔ لیکن وہ "ابن عاصم" ہو یا "ابن اعثم" اس کو شیعہ ظاہر کرنا ایک دلچسپ تحقیق کی ابتدا کرنا ہے

شرح نہج البلاغۃ کا حوالہ بھی مشکوک ہے۔ نہج البلاغۃ کی شرحیں کئی ہیں۔ فارسی بھی عربی بھی۔ علیٰ ہذا شارح شیعہ بھی ہیں اور سُنّی بھی۔ اگر بالفرض شیعہ کی شرح ہو تو بھی اس پر حجت قائم نہیں ہو سکتی

حضرت امیر کا وہ خط جسے "محاسن کتب" سے تعبیر کرتے ہیں خود نہج البلاغۃ میں موجود ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف کی تحریر کا کیا مضمون ہوگا۔ اس کے چند فقرات درج کر دیتا ہوں :-

"وزعمت ان افضل الناس فی الاسلام فلاں وفلاں امراً ان تم اغولک کلہ وان نقص لم یحتفک ثلمۃ"

ارباب نظر جانتے ہیں کہ امیر شام نے اپنے دعوے کی بنیاد خون عثمان پر رکھی تھی اور جہاں عرب اور خصوصاً شام میں اس دعوے کی حقانیت کے لئے کافی پروپیگنڈہ کیا گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عثمان۔ حضرات شیخین ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہیں وہ چاہتا تھا کہ علی کے ہاتھ کی ہی لکھی ہوئی کوئی ایسی تحریر مل جائے جسے مخالفت شیخین پر محمول کیا جا سکے اور دنیا کو بتایا جا سکے کہ علی اس خلافت کے ابتداء ہی سے مخالف ہیں اور وہ شیخین کو اپنے مکتوبات میں بُرا کہہ رہے ہیں۔ انکے وقت میں وہ کچھ نہ کر سکے۔ لیکن عثمان کے وقت میں انھیں موقعہ مل گیا اور چونکہ عثمان شیخین کے قائم مقام تھے اور سیرت شیخین پر عمل کرنا ان کا شعار تھا لہذا انھیں قتل کیا اور وہ اس خون میں قطعاً شریک ہیں۔ مگر علی کی طرف سے جو جواب ملتا تھا وہ ایسا ہوتا تھا کہ سوائے مایوسی کچھ اس کے ہاتھ نہ آتا تھا۔ چنانچہ اس خط میں فرماتے ہیں :-

"وزعمت انی لکل الخلفاء حسدت وعلی کلہم بغیت فان یکن ذلک کذلک فلیس الجنایۃ علیک فیکون العذر الیک"

"تیرا یہ گمان ہے کہ میں نے تمام خلفا سے حسد کیا اور سب پر بغاوت کی۔ اگر یہ معاملہ ایسا ہی ہے تو تیری تو کوئی خطا نہیں کیگئی کہ تیرے سامنے اس کا عذر کرنے کی ضرورت ہو۔ (تجھے کوئی حق مداخلت حاصل نہیں)"

اس کے بعد ایک طعن اور بھی تیز ہے اور اس کا جواب بھی مرقوم ہے۔ اسی سے علی کی روحانی عظمت ان کے مخالفین کی ذہنی پستی معلوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں :-

"تو نے کہا ہے کہ میں بیعت کے لئے اس طرح لایا گیا جیسے اونٹ کو نکیل سے کھینچتے ہوئے لاتے ہیں یہاں تک کہ میں بیعت کروں۔ خدا کی قسم تو نے میری مذمت کا ارادہ کیا مگر میری مدح کر گیا تو نے مجھے فضیحت کرنا چاہا مگر خود رسوا ہو گیا اس لئے کہ مظلوم ہونے میں مسلم کا کوئی نقصان نہیں جب تک وہ اپنے دین میں شک کرنے والا اور اپنے یقین کو شک سے نہ بدلنے والا ہو"

اس خطبہ کے الفاظ سے حقیقت امر واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ علی کی بیعت کس طرح حاصل کی گئی۔ معاویہ اس پر طعن کرتا ہے۔ علی اس واقعہ کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کی وہ توجیہ کرتے ہیں جو علی ہی سے مخصوص ہے۔ اب غیر جانبدارانہ فیصلہ اہل انصاف کے ہاتھ ہے

(۲) اتواق الحمایۃ۔ یحییٰ بن حمزہ شیعہ زیدی کی تصانیف بتائی گئی ہے اور اس کی ایک روایت سے جس کے راوی

سوید بن غفلہ ہیں اور جس سے شیخین کی کامل مدح ظاہر ہوتی ہے استدلال کیا گیا ہے یہ اتواق الحمایۃ مجھے محجاج السالکین کی بہن معلوم ہوتی ہے اگر بالفرض یہ کتاب وجود خارجی بھی رکھتی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں لیکن جب تک صحیح عبارت نہ دیکھ لی جائے اس پر کسی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے خود زید ابن علی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جب اموی فوجوں سے مقابلہ ہوا تو عین کارزار میں ایک شخص نے سوال کیا کہ شیخین کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ظاہر ہے کہ اس موقعہ پر اس کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے چنانچہ جناب زید نے ٹال دیا اور کہا کہ اس کا جواب پھر دیا جائے گا۔ لڑائی شروع ہوئی۔ عین جنگ میں ایک تیر زید کی پیشانی پر لگا وہ گھوڑے سے گر پڑے۔ کچھ لوگ گرد جمع ہو گئے پوچھا وہ سائل کہاں ہے۔ وہ بھی آگیا۔ اس سے کہا کہ دیکھ انھیں کے سبب سے مجھے یہ حالت دیکھنی پڑی۔

غرض علی یا بنو علی سے یہ توقع رکھنا کہ شیخین کی کوئی خاص عظمت ان کے دل میں ہو ایک غلط توقع ہے۔

(۳) تفسیر قمی کے حوالے سے سورۃ توبہ کی آیۃ "ثانی اثنین" کی تفسیر میں حضرت صادق سے ایک روایت نقل ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ روایت موجود ہے لیکن اس سے فایدہ کیا ہے۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے حضرت ابوبکر کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور انھوں نے جعفر اور ان اصحاب کو سمندر میں دیکھ لیا اور عرض کی یا رسول اللہ آپ صدیق ہیں۔

اب کوئی بتائے کہ اس میں شیعوں کے خلاف کیا بات نکلی۔ یہ معجزہ اگر ہے تو رسول اللہ کا ہے۔ شیعہ کب اس امر سے منکر ہیں کہ رسول اللہ کے ہمراہ حضرت ابوبکر غار میں نہ تھے یقیناً تھے مگر محزون و ملول تھے۔ ممکن ہے حضرت نے اس طرح ان کو سکون دینا چاہا ہو

دوسری روایت اسی واقعہ کے متعلق جو تفاسیر شیعہ میں مروی ہے۔ میں اسے نقل نہیں کرتا اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت ابوبکر نے اس واقعہ سے کیا اثر لیا

اہل انصاف صرف اتنا دیکھ لیں کہ اگر ایسی ہی کوئی روایت علی کا استحقاق جتانے کے لئے شیعوں کی طرف سے پیش ہوتی تو ان کو "سفیہ" بنانے کے لئے کوئی لغت باقی نہ رکھا جاتا

(۳) سورۂ نور کی آیت "ان الارض یرثہا عبادی الصالحین" کے متعلق ایک مضمون تفسیر خلاصۃ المنہج سے نقل ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ وعدہ خلفاء کے عہد میں پورا ہوا

اس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ آیت سورۂ نور میں نہیں بلکہ سورۂ انبیاء میں ہے دوسرا امر یہ ہے کہ "صالحین" نہیں ہے بلکہ "صالحون" ہے۔ یہ صفت ہے عباد کی اور عباد از روئے قانون عربیت مقام رفع میں ہے

ان غلطیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اور بغیر اصل کتاب کی طرف رجوع کئے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ تفسیر عامہ میں یہ مضمون موجود ہے اور حسب عادت اہل علم مفسر نے اس قول کو بھی نقل کیا ہوگا۔ باقی تفسیر خاصہ میں اس آیت کے متعلق

جو کچھ آئمہ سے نقل ہوا ہے اس سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا

(۵-۶) ان دو نمبروں میں کشف الغمہ کے حوالے سے دو عجیب و غریب روایتیں نقل ہوئی ہیں:-

(۱) علی کا قول ہے کہ جو ابوبکر کو صدیق نہ کہے۔ خدا اس کی عاقبت خراب کرے

(۲) حضرت ابوبکر کی وفات پر حضرت علی بہت روئے اور کہا "آج نبوت کی خلافت منقطع ہو گئی"

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب "کشف الغمہ" موجود ہے۔ شیعی عالم کی تالیف ہے۔ کتاب کا پورا نام ہے "کشف الغمہ فی مناقب الآئمہ" نام ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ موضوع کتاب کیا ہے؟ حضرت رسول اللہ سے لیکر امام دوازدہم تک کے مناقب و فضائل بیان ہوئے ہیں۔ التزام یہ کیا ہے کہ ہر دو فریق کی روایات بہ سلسلہ مناقب و فضایل میں درج کر دی جائیں اہل عقل خود انصاف فرمائیں کہ مولف کتاب ہر دو روایات مندرجہ بالا کو درج کتاب کر کے اپنے موضوع کو کونسی قوت پہونچا سکتا تھا مگر پھر بھی میں نے حالات حضرت امیر غور سے پڑھے اور افسوس ہے کہ مجھے ان دونوں روائتوں کا کہیں اشارہ بھی نہ ملا۔ اس کے برعکس مولف کتاب کسی اور شے کو درج کر رہا ہے جو قابل ملاحظہ ہے

"فی ذکر الصدیقین، من مناقب ابن المغازلی عن ابن عباس"۔ اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ تحت آیت "السابقون السابقون" ابن عباس سے مروی ہے کہ یوشع ابن نون نے موسیٰ کی طرف سبقت کی اور صاحب یٰسین نے عیسےٰ کی طرف اور علی ابن ابی طالب نے محمد ابن عبداللہ کی طرف اور وہ ان سے افضل ہے

دوسری روایت مسند امام بن حنبل سے نقل کی ہے ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے خود علی کی زبان سے سنا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس کے رسول کا بھائی ہوں اور میں صدیق اکبر ہوں اور میرے سوا جو کوئی بھی اس کا قائل ہو وہ مفتری و کاذب ہے۔ میں نے تمام لوگوں سے سات برس قبل نماز پڑھی ہے۔

یہی مضمون صدیقیت ابولیلی سے نقل ہوا ہے۔ اس کے بعد کتاب شیعہ بصائر الدرجات سے ایک حدیث اس بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مضمون دیگر کتب شیعہ میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ خود مولف کتاب نے بحث القاب میں حضرت علی کا لقب صدیق اکبر تحریر کیا ہے۔ اب بتایا جائے وہ حدیث کس گوشے میں چھپی ہوئی ہے جس سے استدلال فرمایا گیا ہے اور یہ حدیث ختم خلافت نبوت تو اور بھی مزیدار ہے

(۷) "فصول امامیہ" سے ایک حدیث حضرت باقر سے درج کی گئی ہے روایت کا سلسلہ کیا ہے؟ خدا ہی جانے۔

لیکن اس نام کی کوئی کتاب شیعی تصنیفات میں نہیں ہے مجھے حیرت تھی کہ یہ فصول امامیہ کونسی کتاب ہے اور کس فن میں ہے۔ کم از کم میرے علم میں تو نہیں لیکن ظاہر ہے کہ میرا محدود علم حجت نہیں ہے لہذا ایک عراقی بزرگوار سے رجوع کی گئی جو ایک وسیع نظر کے مالک ہیں۔ انھوں نے بھی کانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر سوچتے سوچتے خیال ہوا کہ عجب نہیں "فصول المہمہ" مراد ہو جو ابن صباغ مالکی کی تالیف ہے اور چونکہ یہ کتاب مناقب آئمہ اہل بیت میں ہے لہذا مصنف کو شیعہ ظاہر کر دینے کے لئے

بہت کافی ہے۔ اسی شبہ پر "فصول المہمہ فی معرفت الآئمہ" کو دیکھا گیا۔ حضرت باقرؑ کے حالات میں تلاش کی گئی کہ یہ حدیث یا روایت جو کچھ بھی ہے وہیں ملنی چاہیئے۔ کئی گھنٹے خراب کئے اور نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ میں نہ سمجھ سکا کہ اس قسم کے غلط حوالوں کا مطلب کیا ہے؟ تحقیق حق ہے یا مخاطب کو پریشان کرنا۔ مذہب کی حمایت جب ایسے حیلے حوالوں پر منحصر رہ جائے تو یہ وقت اس مذہب کے لئے نہایت بیکسی کا وقت ہوتا ہے

یہ تو حوالے کی حالت ہے۔ اب رہی حدیث اس کے متعلق چند الفاظ کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

فاضل مضمون نگار نے احادیث کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی ہے:۔

"احادیث میں اتنا اختلاف ہے کہ سعی و کوشش کے تمام مراحل طے کرنے کے باوجود بھی کسی شخص کو اس ذریعہ سے مطمئن کر دینا محال نہیں تو ناممکن ضرور ہے"

یہ گویا عذر فرمایا گیا ہے اس امر کا کہ شیعہ متکلمین جو احادیث کتب اہل سنت سے پیش کرتے ہیں وہ قابل استناد نہیں ہیں سوال یہ ہے کہ آیا یہی حق شیعوں کو بھی حاصل ہے یا نہیں اور نہیں تو کیوں؟ اگر شیعہ استدلال کریں تو ہر مشہور کتاب ہر مقبول راوی ناقابل اعتبار اور اگر حضرات اہل سنت استدلال کریں تو شیعوں کا فرض ہے کہ مجہول روایت اور ہر نامعلوم کتاب کو مستند تسلیم کرلیں۔ این چہ بوالعجبی است

اب میں دیکھتا ہوں نفس مضمون حدیث کو جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء ثلثہ کے بارے میں ان لوگوں کو خوض کرنے سے منع کیا گیا

معلوم ہے کہ حضرت باقرؑ کا زمانہ بنو امیہ کے شباب کا زمانہ ہے اور بنو امیہ کی نگاہیں اہل بیت کی طرف کیسی تھیں۔ اسکا جواب تاریخ دے سکتی ہے اور آپ خود بھی واقف ہیں یہ بھی ظاہر ہے کہ بنو امیہ کی خلافت کی بنیادیں خلافت شیخین پر قائم ہوئی تھیں اور حضرات ثلثہ یا ان کی حکومتوں پر تنقید کرنا حکومت وقت کو برا کہنا تھا۔ ایسے وقت میں ان عوام کو جو گزرگاہ پر بیٹھ کر یہ تذکرے کرتے تھے اگر حضرت نے سختی کے ساتھ روکا تو اس میں تعجب کیا ہے؟

حضرت باقر علیہ السلام کی محتاط زندگی ہمارے سامنے موجود ہے۔ جابر ابن یزید کو ایک کتاب دیجاتی ہے کہ اسے حفظ کرو لیکن جب تک بنو امیہ کی حکومت ہے اس کتاب کا ایک لفظ ظاہر نہ کرو[1]

اگر جناب باقرؑ کے ان اشاروں پر جو بہ نظر مصلحت تھے آپ استدلال کر رہے ہیں تو حضرت کے دوسرے ارشادات پر بھی آپ کو نظر فرمانی چاہیئے

---

[1] شیعہ مسئلہ تقیہ کو مانتے ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے ضمناً حاشیہ پر اشارہ بھی کیا ہے میں عرض کرتا ہوں کہ "دل میں بت۔ زبان پر خدا" اسے نفاق کہتے ہیں اور "دل میں خدا زبان پر بت" تقیہ ہے وہ بھی عند الضرورت۔ پڑھئے سورۂ نحل کی یہ آیت "من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان"

(۸) ہاں نہج البلاغۃ میں یہ خطبہ مذکور ہے۔ حضرت امیر نے جناب خلیفہ دوئم کو میدان میں جانے سے روکا ہے۔ بہتر ہو کہ مناظرین اہل سنت اس خطبہ کو درمیان میں لانے سے اجتناب فرمائیں، کیونکہ اس صورت میں سب سے پہلے حضرت خلیفہ دویم کی مہارت جنگ پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔ یہاں صرف اس قدر وضاحت کافی ہے کہ علی کے زمانہ میں جتنی لڑائیاں ہوئیں۔ علی بنفس نفیس ان میں شریک تھے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ غزوات میں خود رسول اللہ شریک ہوتے تھے گویا غزوات میں خود شریک ہونا سنت پیغمبر ہے۔ پھر حضرت خلیفہ دویم کو اس سنت رسول سے کیوں روکا گیا؟ بات یہ ہے کہ رسول اللہ کا یا علی مرتضیٰ کا لشکر کے ساتھ ہونا ہر جہت سے مفید تھا اور حضرت ممدوح کی ہمراہی جنگی نقطۂ نگاہ سے لشکر کے لئے مضر تھی اور علی جانتے تھے کہ اس مضرت کا اثر اسلام کی عمومی حالت پر اچھا نہ پڑے گا لہذا تالیف قلب کے ساتھ روکدیا۔

(۹) "جلاء العیون" کے باب الوصایا سے حضرت علی کی وصیت نقل کی گئی ہے:۔

"اصحاب رسول کی رعایت کرو کہ انھوں نے خدا کے دین میں کوئی نئی بات جاری نہیں کی اور نہ بدعتی کو اپنے پاس آنے دیا"

یہ حوالہ صحیح ہے مگر بغیر کتاب دیکھے ہوئے نقل ہوا ہے، میں عین عبارت نقل کرتا ہوں:۔

"از خدا بترسید در باب اصحاب پیغمبر خود و رعایت نمائید آنہا را کہ در دین خدا بدعتے نکردہ اند و صاحب بدعتے را پناہ ندادہ اند بدرستیکہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وصیت فرمود در حق این گروہ از صحابہ خود و لعنت کرد بر کسیکہ بدعتی کند از صحابہ و غیر صحابہ کسے را کہ صاحب بدعتی را پناہ دہد و یاری کند"۔

ترجمہ "اپنے پیغمبر کے ان اصحاب کے بارے میں خدا سے ڈرو کہ جنھوں نے دین خدا میں کوئی بدعت نہیں کی اور صاحب بدعت کو پناہ نہیں دی۔ بدرستیکہ حضرت رسول نے اپنے اصحاب کے اس گروہ کے بارے میں وصیت کی ہے اور لعنت کی ہر اس شخص پر جو بدعت کرے۔ وہ صحابہ سے ہو یا غیر صحابہ سے اور اس پر جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اس کی مدد کرے"۔

شکر ہے کہ ابھی ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ وہ دیکھیں کہ عبارت کتاب کیا کہتی ہے اور مفہوم کیا لیا گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ تحریف معنوی کی اتنی دلچسپ مثالیں وقت ہی سے دستیاب ہوتی ہیں۔

روایت کا آخری ٹکڑا بتا رہا ہے کہ وصیت ان اصحاب کے بارے میں کی گئی ہے جو بدعتی نہوں اور بدعتی کو پناہ دینے والے نہ ہوں اور جو بدعتی ہوں خواہ وہ صحابی ہوں یا غیر صحابی ان پر تو لعنت کی گئی ہے۔ مترجم نے پہلی سطر کو دیکھ کر دھوکہ کھایا ہے اور "آنہا را" کو پہلے جملے سے متعلق کر کے جملہ ختم کر دیا ہے اور اس طرح عبارت اپنے آخر جزو سے نامربوط ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کو مفید سمجھا ہے اور اسی پر اکتفا فرمائی گئی ہے

"الوہی خلافت"

اب تک جسقدر توضیح کی گئی ہے اس کے لحاظ سے اہل نظر غالباً شیعی عقیدۂ خلافت کو سمجھ گئے ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ وہ جو کچھ کہتے اور سمجھتے ہیں اس کی صحیح ترجمانی نہیں کی جاتی

اب اس عنوان کے تحت فاضل مضمون نگار کے اعتراضوں کا جواب بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس میں بیشتر وہی امور ہیں جن کی تفصیل کی جا چکی ہے

تحریف قرآن کے متعلق حیات القلوب کی عبارت "ثلث قرآن در فضائل اہل بیت و ثلثے در مثالب دشمنان ایشان است" کے سمجھنے میں اشتباہ ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی قرآن جو اسوقت موجود ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقوں کی مسلم الثبوت کتاب ہے اس کا ثلث حصہ مناقب اہل بیت پر اور ثلث مثالب دشمنانِ اہل بیت پر مشتمل ہے۔ اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں جسے فاضل مقالہ نگار ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح وہ روایتیں جو کتب شیعہ سے پیش کی گئی ہیں اور جو عدم نص امامت علوی پر (بخیال مضمون نگار) دلالت کرتی ہیں۔ لائق غور ہیں

(۱) اہل تشیع کے مشہور مجتہد سجزانی نے شرح نہج البلاغۃ (مطبوعہ طہران) میں یہ روایت نقل کی ہے۔ خلاصہ روایت یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ نے حضرت حفصہ کو خبر دی کہ میرے بعد ابوبکر خلیفہ ہوگا اور اس کے بعد تیرا باپ۔ حضرت حفصہ نے یہ راز حضرت عائشہ سے کہدیا۔ الخ

یہ مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے اور یہ چیزیں ہمیشہ سے شیعوں کے پیش نظر رہی ہیں۔ شیعہ نظریہ ان روایات کے متعلق ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اگر کوئی پیشین گوئی کیجائے تو یہ پیشین گوئی کسی واقعہ کی حقانیت یا عدم حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ فرض کیجئے آج یہودی فلسطین یا اس کے کسی حصہ پر قابض ہیں، اور اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی کسی کتاب سماوی میں پائی جائے تو کیا اس سے یہود کی حقانیت پر دلیل لائی جا سکتی ہے

حضرت رسول اللہ نے حضرت علی کو وصیتیں کرتے ہوئے خبر دی ہے کہ میرے بعد یہ امور ظہور میں آئیں گے جس پر علی نے پوچھا کہ میرا رد یہ کیا ہونا چاہئے۔ فرمایا "صبر" یہی وہ راز باطنی ہے جس پر اہل دل حیرت کرتے ہیں اور اہل دنیا کوئی طعنہ اٹھا نہیں رکھتے ۔ الغرض یہ پیشین گوئی حضرات خلفاء کی حقیت کو ثابت نہیں کرتی

(۲) جلاء العیون میں لکھا ہے کہ حضرت رسول پر جب مرض کا غلبہ شدید ہوا تو آپ نے چاہا کہ اپنی میراث و جانشینی اپنے چچا حضرت عباس کے سپرد کر دیں۔ حضرت عباس نے کہا یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میری بجائے حضرت علی کے سپرد کر دیا جائے" نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ رسول کریم اپنی وفات کے بعد صرف حضرت علی ہی کو خلافت کا حقدار تصور نہ کرتے تھے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل عبارت نقل کر دوں تاکہ مبصر کو مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے

"اے عم پیغمبر قبول کن وصیت مرا در اہل من و در زنان من و بگیر میراث مرا و ادا کن دین مرا و وعدہ ہائے مرا بعمل بیاور و ذمۂ من بری بگردان ۔ عباس گفت یا رسول اللہ من مرد پیر عیال دارم و تو از ابر بہاری بخشندہ تری و مال من وفائی نکند بوعدہ ہائے تو و بخششہائے تو ایں را از من بگردان بسوئے کسے کہ طاقتش از من بیشتر باشد و حضرت سہ مرتبہ ایں سخن را مرا و اعادہ کرد و در ہر مرتبہ او چنیں جواب گفت پس حضرت فرمود کہ میراث خود را بکسے دہم کہ قبول کند آں را کہ حق قبول کردنی

است و سزاوار آں باشد و چنانچہ تو گفتی جواب نگویدپس با حضرت امیر المومنین خطاب کردو فرمود یا علی تو گیر میراث مرا کہ مخصوص تست و کسے را با تو نزاعے نیست و قبول کن وصیت مرا و بعمل بیار وعدہ ہائے مرا و ادا کن قرضہائے مرا یا علی خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالات من بعد از من بمردم بکن"

(ترجمہ) اے چچا میرے اہل کے بارے میں اور میری عورتوں کے بارے میں میری وصیت کو قبول کرو اور میری میراث لے لو۔ میرا قرض ادا کرو اور میرے وعدوں کو عمل میں لاؤ اور مجھے بری الذمہ کردو۔ عباس نے کہا یا رسول اللہ میں بوڑھا آدمی ہوں عیال دار ہوں آپ ابر بہاری سے بڑھ کر بخشش کرنے والے۔ میرا مال آپ کے وعدوں اور آپ کی بخششوں کے لئے وفا نہیں کر سکتا۔ اس وصیت و میراث کو اس کی طرف پلٹائے جس کی طاقت مجھ سے بیشتر ہو حضرت نے تین مرتبہ اسی ارشاد کو دوہرایا اور ہر مرتبہ عباس نے یہی جواب دیا پس حضرت نے فرمایا کہ اپنی میراث ایسے کو دونگا کہ جو اسے اس طرح قبول کرے جو قبول کرنے کا حق ہوتا ہے اور وہ اس کے لئے سزاوار ہو اور جس طرح تو نے کہا اس طرح جواب نہ دے پس حضرت امیر المومنین سے خطاب کیا اور فرمایا یا علی تو میری میراث لے کہ تجھ ہی سے مخصوص ہے اور کسی کو تجھ سے نزاع کا حق نہیں میری وصیت قبول کر۔ میرے وعدوں کو عمل میں لا۔ میرے قرضوں کو ادا کر اور اے علی میرے اہل میں میرا خلیفہ ہو۔ اور لوگوں پر میرے پیغاموں کی تبلیغ کر" یہ ہے عین عبارت اور اس کا ترجمہ۔ میں اس روایت پر از روئے روایت کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ صرف نفس مضمون کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس روایت میں میراث کا تذکرہ ہے۔ حضرت رسول اپنے چچا سے فرماتے ہیں کہ اگر میری میراث لینی چاہتے ہو تو ان شرائط کے تحت لے سکتے ہو۔ عباس اپنے افلاس کا عذر کرتے ہیں۔ تین مرتبہ یہی بات دہرائی جاتی ہے تاکہ عباس کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور آخر یہ شے علی مرتضیٰ کو تفویض ہوتی ہے۔ نزاکت کلام یہ بھی ہے کہ عباس سے فرماتے ہیں "قبول کن وصیت من در اہل من و در زنان من" اور علی سے فرماتے ہیں "علی خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالات من بعد از من بمردم کن" رسول اللہ کے اس ارشاد اور وصیت کا مطلب کیا تھا وہ اس جواب سے ظاہر ہے "یا رسول اللہ من مرد پیر و عیال وارم" ظاہر ہے کچھ خرچ کا معاملہ تھا اور اہل رسول و زنان رسول کی خبر گیری کا بار پڑتا تھا اس لئے انکار کر دیا

میں نہ سمجھ سکا کہ خلافت و امامت سے اسے ربط کونسا ہے۔ واقعاً عباس کے خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی جو معترض نے پیدا کی اور علی کو بھی جو اس مقام میں خلافت دی گئی ہے وہ خلافت خاصہ ہے یعنی اہل رسول و زنان رسول کے مثل رسول محافظ و نگراں رہیں اور ان کا حکم مثل رسول ان پر جاری ہو۔ غرض معترض کے پیش کردہ نتیجہ سے اس روایت کو کوئی تعلق نہیں

(۳) ملا باقر مجتہد نے حضرت امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ ایک بار نبی کریم نے بارگاہ ایزدی سے ہزار حاجتیں طلب کیں۔ خدا تعالےٰ نے سب روا کر دیں آخر شب میں حضرت علی بھی مسجد میں تشریف لائے۔ رسول خدا نے فرمایا اے

علی تمہاری خلافت و امامت کے واسطے ہم نے جو دعا کی وہ بارگاہ خداوندی سے منظور نہیں ہوئی۔ (حیات القلوب جلد ۲)

فاضل مقالہ نگار نے اس مقام پر یہ فخریہ عبارت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اگر میں حدیث گڑھنے پر آتا تب بھی اس سے زیادہ صاف۔ واضح اور غیر مبہم حدیث گڑھنے میں شاید مشکل کامیاب ہو سکتا۔

اب ذرا اصل عبارت ملاحظہ ہو:۔

"حضرت رسول شبے در مسجد ماند چوں نزدیک صبح شد حضرت امیر المومنین داخل مسجد شد پس حضرت رسول او را ندا کرد کہ یا علی گفت لبیک فرمود بیا بسوئے من چوں نزدیک شد حضرت فرمود تمام ایں شب را دیدی در اینجا بسر آوردم و ہزار حاجت خود را از خدا سوال کردم و ہمہ را بر آورد و مثل آنہا را نیز برائے تو سوال کردم و باز ہمہ عطا کرد و سوال کردم از برائے تو کہ ہمہ امت را مجتمع گرداند برائے تو کہ ہمہ اقرار کنند بخلافت تو، قبول نہ کردو ایں آیات را فرستاد " الم احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وہم لا یفتنون و لقد فتنا من قبلہم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین"

(ترجمہ) ایک شب رسول نے مسجد میں قیام فرمایا جب صبح نزدیک ہوئی تو حضرت امیر المومنین داخل مسجد ہوئے پس حضرت رسول نے آواز دی یا علی، عرض کی لبیک۔ فرمایا میرے پاس آؤ۔ جب نزدیک آئے فرمایا تم نے دیکھا کہ یہ رات میں نے یہیں بسر کی ہے اپنی ہزار حاجتیں خدا سے طلب کیں۔ خدا نے انھیں پورا کیا اور انھیں کی مانند (ہزار حاجتیں) تیرے لئے بھی سوال کیا۔ وہ تمام سوال بھی پورے ہوئے اور میں نے سوال کیا کہ تمام امت کو تیرے واسطے جمع کر دے کہ سب تیری خلافت کا اقرار کریں اور سب تیرے تابع ہوں۔ یہ سوال قبول نہ ہوا اور یہ آیت بھیجی گئیں۔ آلم۔ کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی اور البتہ ہم نے ان کو بھی آزما لیا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے اور البتہ خدا جانتا ہے جو سچے ہیں اور البتہ خدا خوب جانتا ہے انھیں جو جھوٹے ہیں"

اہل بصیرت جانتے ہیں کہ منزل وحی نے حقایق کو نہایت سادہ زبان میں بیان فرمایا ہے۔ علی کو بتایا جا رہا ہے کہ مشیت الٰہی کسی کو کسی فعل پر مجبور نہیں کرتی۔ لہٰذا ایسا نہیں ہوگا کہ تمام لوگوں کو خداوند عالم مجبور کر کے تیری خلافت پر مجتمع کرے اور جبر سے کام لیکر انھیں تیرا تابع بنائے۔ بلکہ ایک شان اختیاری کے ساتھ انھیں معرض امتحان میں رکھا گیا ہے اور تو انکے لئے وجہ امتحان ہے۔ اور یہ آیات سورۂ عنکبوت اس مسئلہ پر روشنی ڈال رہی ہیں"

یہ ہے وہ مطلب جو اہل عقل اس حدیث سے اخذ کرتے ہیں۔ اب کیا اہل انصاف میری طرف سے دریافت کر سکتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے یہ مفہوم کہاں سے پیدا کیا ہے اور "اے علی ہم نے تمہاری ولایت و خلافت کے واسطے دعا مانگی وہ نامنظور ہوئی" یہ کونسی عبارت کا ترجمہ ہے

(۴) ایک روایت عیون الاخبار سے نقل فرمائی گئی ہے کہ حضرت خضر نے علی مرتضیٰ کو رابع الخلفا کہکر سلام کیا

فاضل مناظر نے عیون الاخبار تو نہیں دیکھی۔ اس کا تو یقین ہے لیکن خیر اس امر سے قطع نظر کرتے ہوئے عرض

کرتا ہوں کہ یہ مضمون شیعوں میں مشہور ہے اور معمولی معمولی اہل ممبر بھی اسے بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اصطلاحی جملہ ہے جسکی توضیح یہ ہے کہ خلفائے اربعہ شیعوں کے نزدیک حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حضرت آدم (۲) حضرت داؤد (۳) حضرت ہارون (۴) حضرت علی، کہا جائے گا کہ یہ تاویل ہے اور خدا جانے کیا ہے میں عرض کروں گا کہ جس قوم کی اصطلاح ہو وہی اس کی تشریح کی حقدار ہوتی ہے۔ عقلا کبھی اس پر ایراد نہیں کرتے تمام علوم و فنون میں یہی قاعدہ جاری ہے

(۵) نہج البلاغۃ کے حوالے سے یہ عبارت نقل ہوئی ہے:۔

"ان امیر المومنین قال الناس جماعتا ویداللہ علیہم غضب اللہ علی من خالف الجماعۃ انا واللہ اہل السنۃ والجماعۃ"
امیر المومنین نے فرمایا کہ لوگ جماعت ہیں اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت کی مخالفت کرتا ہے۔ خدا اسپر غضبناک ہوتا ہے۔ خدا کی قسم میں اہل سنت والجماعت ہوں (یعنی سنت رسول کا پابند ہوں اور مسلمانوں کی مجموعی جماعت کا فرد ہوں)

آخر کلام میں افتخارا ارشاد ہوا ہے کہ ان روایات کو پیش کر دینے کے بعد غالبا مجھے مزید توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ عبارتوں سے جو مطالب وضع کئے جاتے ہیں ان کی حجت پر یقین کرنے کی ایک میزان ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مفہوم صحیح ہے یا غلط اسی معیار پر پیش کردہ عبارت کے مفہوم کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:۔

(۱) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے (نتیجہ) پس لوگوں پر اللہ کا ہاتھ۔ (مفہوم اول)

(۲) لوگ جماعت ہیں (۲) اور جماعت کی شان یہ ہے کہ اس کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (نتیجہ) پس لوگوں کی مخالفت سے اللہ غضبناک ہوتا ہے (مفہوم ثانی) ماشاء اللہ کیا خوب عبارت اور کیا خوب مفہوم۔

"انا واللہ اھل السنۃ والجماعۃ" یہ تو معلوم ہے کہ اصطلاحی معنوں میں تو یہ کلمہ "اھل السنۃ والجماعۃ" استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ اصطلاح مولد ہے اور بعد کو وضع کی گئی ہے اسی لئے ترجمے میں بھی اس کی توجیہ فرمائی گئی اب معلوم نہیں ہوتا کہ اس جملہ سے کیا فایدہ اٹھانے کی توقع کی گئی ہے

اس کے علاوہ یہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ نہج البلاغۃ کے کس خطبہ میں یہ عبارت مرقوم ہے۔ آیا خطبات میں ہے؟ فرامین میں ہے۔ کلمات مختصرہ میں ہے؟ کہاں ہے؟

ارباب علم ہرگز تعجب نہ فرمائیں۔ مذہب عمومی کی بنیاد انھیں دلچسپ صداقتوں پر اٹھائی جاتی ہے اور عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے ہمیشہ سے یہی نسخہ استعمال ہوا ہے

سیاسی اختلاف

اس عنوان کے ماتحت اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب شیعہ کی ابتدا عبداللہ بن سبا ایک نومسلم یہودی سے ہوئی۔

میں پہلے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ عبداللہ بن سبا کو طنزاً تو مسلم کہنا درست نہیں اس لئے کہ اسوقت جو لوگ مسلمان ہوئے وہ مشرکین قریش ہوں یا غیر قریش۔ یہودی ہوں یا نصرانی۔ سب کے سب نومسلم تھے۔ سوائے ایک مخصوص خانوادہ کے مخصوص افراد کے کہ ملت ابراہیمی جن کے سینوں میں بطور امانت چلی آرہی تھی۔ اس کے بعد فاضل استرآبادی کی تحریر سے استدلال کیا گیا ہے اور یہ تحریر پیش کی گئی ہے:۔

"وکان (عبداللہ بن سبا) اول من شرع بالقول الفریضۃ امامۃ علی"

"عبداللہ بن سبا پہلا شخص تھا جس نے یہ بات نکالی کہ حضرت علی کی امامت مذہبی فریضہ ہے"

اب ارباب نظر انصاف کی آنکھوں سے اس دعوے کو ملاحظہ فرمائیں، میں فاضل مضمون نگار کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انکی بدولت کتب رجال کی ورق گردانی کا موقعہ ملا۔ فاضل استرآبادی کا پورا نام ہے "مرزا محمد بن علی بن ابراہیم استرآبادی" کتاب کا نام ہے "تلخیص المقال فی اسماء الرجال" اس کتاب کی عبارت یہ ہے:۔

"عبداللہ بن سبا غالی ملعون، کان یزعم ان علیا الہ وانہ نبی لعنہ اللہ"

بس عبداللہ بن سبا کے ترجمے میں بھی دو تین سطریں اس کتاب میں مرقوم ہیں۔ اس سے زیادہ ایک حرف نہیں یعنی عبداللہ بن سبا "غالی" ہے ملعون ہے۔ وہ گمان کرتا تھا کہ علی خدا ہے اور وہ خود نبی ہے خدا اس پر لعنت کرے"

اگر اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے کہیں انصاف ہے تو اس علمی خیانت کو دیکھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔

مزید توضیح کے لئے علامہ بہبہانی کا قول بھی نقل کئے دیتا ہوں کہ:۔

"عبداللہ بن سبا اصحاب امیر المومنین سے تھا جو کفر کی طرف پلٹ گیا اور جس غلو کا اظہار کیا۔ حضرت صادق سے منقول ہے کہ عبداللہ بن سبا نبوت کا مدعی تھا اور گمان کرتا تھا کہ امیر المومنین خدا ہے۔ یہ خبر امیر المومنین کو پہونچی۔ آپ نے اسے بلایا اور پوچھا اس نے اقرار کیا اور کہا تو ہی خدا ہے اور میرے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ تو خدا ہے اور میں نبی ہوں امیر المومنین نے اس سے فرمایا کہ تجھے شیطان نے مسخرہ بنایا ہے۔ اس قول سے رجوع کر تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔ آپ نے اصرار کیا اور اس نے انکار۔ حضرت نے اسے تین دن قید رکھا اور چاہا کہ توبہ کرے مگر اس نے توبہ نہ کی۔ اسے قید خانہ سے نکالا اور آگ میں جلا دیا"

ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ عند الشیعہ "عبداللہ بن سبا" کی کیا ہستی ہے۔

اب یہیں سے عین اللہ ویداللہ وغیرہ کی بابت سن لیجئے اگر بروایت صحیحہ یہ کلمات علی کی زبان سے یا کسی دوسرے معصوم کی زبان سے نکلے ہوئے ثابت ہو جائیں تو بیشک ان پر گفتگو ہو سکتی ہے گو یہ بھی شیعی معتقدات کے آسمانی تخیل کو متاثر نہیں کر سکتے۔ البتہ علمائے سنت والجماعت میں بہ کثرت ایسے حضرات مل سکتے ہیں جنھوں نے اس سے بھی بڑھ کر کچھ کہا ہو پھر ان کے متعلق کیا رائے ہے؟

علامہ مجلسی کا قول حضرت امام حسین کی بابت جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے یہ ایک گروہ کا قول نقل ہوا ہے اس سے شیعی اصول مذہب کا کیا تعلق اور کسی طائفہ گمنام کا قول نقل کر دینا کس برم میں داخل ہے؟

شیخ ابو جعفر طوسی سے جو روایت نقل کی گئی ہے اس کی صحت بھی اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں "کہ محبت اہل بیت تمام اعمال کی روح ہے" یہ عقیدہ شیعہ ہے حضرات اہل سنت نہیں مانتے نہ مانیں۔

اب رہا دوست دشمن کے متعلق ارشاد علوی۔ اس کے متعلق "کلینی" اور "مسعدی" کا بے تکا جوڑ ملانے کی ضرورت نہیں۔ یہ قول نہج البلاغۃ میں موجود ہے:۔ "ھلک فی رجلان محب غال ومبغض قال" میرے بارے میں دو شخص ہلاک ہوئے۔ وہ دوست جو غلو کرے اور وہ بغض رکھنے والا جو میرے مرتبہ میں کلام کرے

غلو کی حالت تو معلوم ہو گئی اب یہ مراتب علویہ میں کلام کرنے والا کون ہے؟ ارباب نظر اس کی تنقید فرمائیں

منقولات کے متعلق انتہائی اختصار کے ساتھ مجھے جو لکھنا تھا لکھ چکا۔ اس تحریر میں میرا نقطۂ نگاہ اس مجیب کا سا ہے جس نے صرف دفع ایراد کے لئے قلم اٹھایا ہو ورنہ اثبات مطلب کے لئے میدان دوسرا ہے

آخر میں یہ سوال ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ "عبداللہ بن سبا" کے واقعہ کو سیاسیات سے کیا تعلق ہے۔ ایک شخص اسلام لایا پھر کفر اختیار کیا۔ علی کو خدا کہنے لگا۔ اسے جلا دیا گیا، اس میں کونسا سیاسی پہلو ہے اگر کہا جائے کہ وہ اصحاب علی میں سے تھا تو اس سے ذات علی یا دیگر اصحاب علی یا تشیع پر کیا الزام؟ بات دور جاتی ہے اور میں اس عنوان کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

اب میں اس ایراد کی طرف توجہ کرتا ہوں جسے طرح طرح کی رنگ آمیزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ شیعہ مسلک کی بنیاد دوسروں سے نفرت پر قائم ہوئی ہے

قارئین کرام کی خدمت میں التماس ہے کہ مذہب شیعہ کے اصول یہ ہیں:۔ (۱) خدا کو واحد و یکتا ماننا (۲) خدا کو عادل ماننا (۳) نبوت خاتم النبیین پر ایمان لانا اور انبیا کو معصوم سمجھنا (۴) خلافت و امامت کو من اللہ قبول کرنا (۵) روز جزا پر اسی حیثیت سے ایمان لانا جس حیثیت سے پیغمبر نے تعلیم دی ہے

ان اجزا پر نظر کرتے ہوئے مجھے نہیں معلوم ہوتا کہ کس جزو کی بنا پر مذکورۂ بالا الزام درست ہو سکتا ہے

ہاں خلافت کے معاملے میں وہ لوگ جو دینوی حیثیت سے مسلمانوں کے حاکم بنے، شیعوں کے نزدیک انھیں مذہبًا کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور ایسے چند اشخاص کے خلاف جو مبعوث یا منصوص من اللہ ہیں وہ اپنے نقطۂ نظر سے مخالفانہ اظہار خیال پر مجبور ہیں

یہ ایک فطرت انسانی ہے کہ انسان جس شے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ اس سے اظہار بریت کر ہی دیتا ہے۔ اگر انبیاء کا فعل قابل اقتدا ہے تو سورۂ توبہ کی اس آیت کو پڑھئے:۔ "وما کان استغفار ابراہیم لابیہ الا عن موعدۃ

وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ ان ابراہیم لاواہ حلیم ۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو شخص اپنے دوست کا دشمن ہو اس سے اظہار برات کرنا حلم کے خلاف نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی نظری حیثیت اتنی ہی ہے۔ اب رہا دوسروں کے جذبات کا احترام البتہ یہ ضروری شے ہے لیکن مثل مشہور ہے کہ "اکرم تکرم" اکرام کرو تمہارا بھی اکرام کیا جائے گا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر کوئی طبقہ اپنی کثرت کے اعتبار پر خود جس طرح چاہے عمل کرے اور قلت سے اپنے جذبات کے احترام کا متمنی رہے تو یہ نباہ کی باتیں نہیں ہیں۔

ذاکر حسین

آپ کے فایدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علٰحدہ علٰحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ بریں

نگارستان	جمالستان	ترغیبات جنسی	شہاب کی سرگزشت	استفسار و جواب ہر سہ جلد
دو روپیہ	چار روپیہ	تین روپیہ	ایک روپیہ	نو روپیہ
معرکۂ سخن	مکتوبات نیاز	اردو شاعری	ہندی شاعری	میزان کل
ڈھائی روپیہ	ڈھائی روپیہ	دو روپیہ	ڈیڑھ روپیہ	ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار، لکھنؤ

غالب پھر اس دُنیا میں

(پروفیسر فراق گورکھپوری کی تقریر جو ۲۳ جون کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی)

جب میں اس دنیا میں تھا تو بے چین ہو کر ایک بار میں نے کہا تھا:۔

موت کا ایک دن مقرر ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آج موت کی گہری نیند پھر اُچٹ گئی۔ کیا نیند، کیا موت، دونوں میں کسی کا اعتبار نہیں۔ جب زندہ تھے تو زندگی کا رونا تھا اور موت کی تمنا تھی۔ میں نے کہا تھا:۔

قید ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شمع اور سحر کا کیا ذکر ہے۔ میں نے تو کھلی کھلی بات کہدی تھی۔ ہاں ایک اور شعر یاد آگیا:۔

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن ذوقؔ نے اس سے بھی زیادہ لگتی ہوئی بات کہی تھی۔ وہ نہ جانے یہ شعر کیسے کہہ گئے تھے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہاں تو میں کہاں ہوں۔ ابھی میرے حواس درست نہیں۔ لیکن یہ زمین اور یہ آسمان تو کچھ جانے بوجھے معلوم ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ایک طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہوں میں بھی انھیں کے ساتھ ہو لوں۔ "پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

اب ان راستوں پر پالکیاں جاتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ گھوڑوں کی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ لیکن ان کی شکل و صورت بالکل بدلی ہوئی ہے۔ آنکھوں کے سامنے بیسیوں ایسی گاڑیاں بھی گزر گئیں جن میں کوئی جانور جُتا ہوا نہیں تھا۔ سُن رہا ہوں کہ لوگ انھیں موٹر کار کہتے ہیں۔ ان کل پُرزوں سے چلنے والی گاڑیوں میں تیزی اور بھڑک تو بہت ہے لیکن پُرانی سواریوں کی بات ان میں کہاں۔ خیر یہ تو ہونا تھا۔ آج سے نہ جانے کتنے برس پہلے جب میں اس دنیا میں تھا زمانہ کروٹ بدل چکا تھا۔ یہ کایا پلٹ آنکھوں کے لئے نئی چیز ہو اور دل و دماغ کو بھی حیرت میں ڈالدے، لیکن میری آنکھوں نے تو اسی وقت جب پچھلی زندگی پائی تھی وہ وہ انقلاب دیکھے تھے کہ اب کیا کہوں، حیرت کیا کروں اور کس بات پر کروں۔ بچپن اور جوانی میں قلعہ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھا

تھا۔ محفل دربار کی جھلملاتی ہوئی شمع "داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی" پھر بھی ایک نیا رنگ پیدا کر رہی تھی۔ شہر کے شریفوں اور رئیسوں کی زندگیاں دیکھی تھیں۔ دور دور تک کا سفر گھوڑوں پر، بہلیوں پر، پالکیوں پر اور ڈاک گاڑیوں پر طے کیا تھا پھر ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا، غدر کیا، قیامت آگئی۔ اس کے بعد پچھلی ہی زندگی میں ریل کی سواری پر دلی سے کلکتہ کا لمبا سفر پورا کیا۔ معلوم نہیں کلکتہ کی شان اب کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہوگی۔ اُسی وقت یہ شہر دولہن بنا ہوا تھا۔ جس کی یاد سے اب بھی تڑپ اُٹھتا ہوں:۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں، ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

اور یوں تو نہ کچھ رونق میں رکھا ہے نہ اُجڑی حالت میں رکھا ہے۔ نہ آبادی میں نہ ویرانے میں۔ پھر بھی جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے غنیمت ہے:۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

انسان جب زندگی کی مصیبتوں سے پریشان ہو جاتا ہے تو اُسے دُنیا چھوڑنے کی سوجھتی ہے۔ اپنے کو دھوکا دینے اور غلط راستہ پر چلنے کو اکثر لوگ خدا کی تلاش یا سچائی کا پانا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سچائی کی بھی سچائی مجھے معلوم ہے:۔

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت جب پا نہ سکے اُس کو تو آپ اپنے کو کھو آئے

دنیا کو چھوڑ کر تو پیغمبر بھی کچھ نہیں ہوتا

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

میں اپنے خیالات کی دھن میں کہاں نکل آیا۔ یہ تمام چیزیں یہ مکانات اور یہ آبادی نئی بھی معلوم ہوتی ہیں اور پرانی بھی۔ اجنبی بھی اور مانوس بھی۔ وہ سامنے دھندلکے میں لال قلعہ نظر آرہا ہے کچھ دور پر جامع مسجد کے برج اور مینار نظر آرہے ہیں میں دلی ہی میں ہوں۔ ہائے دلی! وائے دلی!!

اس بازار کی شان تو دیکھنے کی چیز ہے۔ چاندنی چوک! اچھا یہ وہی پرانا چاندنی چوک ہے جو بار بار لُٹا اور بار بار آباد ہوا۔ اُجڑا اور بسا۔ اس کا نام تک نہیں بدلا۔ یہاں تو نئی زندگی کے شور و پکار میں بھی یہاں کی نئی آوازوں میں بھی پرانے نام کان میں پڑ رہے ہیں۔ کوچہ چیلیاں کوچہ بلیماراں ان دو محلوں میں برسوں میرا قیام رہا ہے۔ بہار آتی ہے اور چلی جاتی ہے لیکن باغ وہی رہتا ہے

اس بازار میں اُس دوسری دنیا سے پلٹ کر کیا خریدیں۔ جب زندہ تھے تبھی یہ حال تھا کہ:۔

درم و دینار اپنے پاس کہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

لیکن اس طرف کچھ کتاب بیچنے والوں کی دوکانیں ہیں۔ کتابوں کی دنیا مردوں اور زندوں دونوں کے بیچ کی دنیا ہے یہاں ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ "ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں"۔ چلیں ذرا کتابوں کی اس خیالی دنیا کی سیر کریں۔ وہ

ایک طرف الماری میں کوئی نہایت اچھی اور قیمتی کتاب رکھی ہوئی ہے۔ جلد تو دیکھو کیسی خوبصورت ہے۔ سنہرے حرفوں سے کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اُس کے برابر چھوٹی چھوٹی کتابیں دیکھنے میں کیسی بھدی معلوم ہوتی ہیں۔ "ارے بھئی ذرا یہ سامنے لگی ہوئی کتابیں تو اُٹھا دینا وہی جو سامنے کے تختے پر الماری میں لگی ہوئی ہیں۔ چھپائی اور لکھائی کے یہ کھیل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے دیوان غالب، دیوان غالب، دیوان غالب۔ مرقع چغتائی!! میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ برلن اور ہندوستان کے کئی شہروں سے یہ کتابیں نکلی ہیں۔ کیوں بھئی ذوق اور مومن، ناسخ اور آتش، میر اور سودا یہ سب کے سب غالب سے زیادہ مشہور تھے ان کے کلام تو اور ٹھاٹ سے چھپے ہوں گے۔ ذرا انھیں بھی دیکھوں۔ کیا کہا؟ صرف غالب کے دیوان اس اہتمام سے نکلے ہیں۔ پھر کیا کہا؟ آج غالب کی کہی ہوئی باتوں کا سارے ہندوستان میں شور ہے غالب پر کتابیں اور غالب پر مضامین کثرت سے نکل رہے ہیں۔ اچھا یہ کہنا بھی کسی ڈاکٹر بجنوری کا ملک میں مشہور ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی کتابیں ہیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب۔ تو صرف رہنا سہنا ہی اس ملک کا نہیں بدلا ہے بلکہ مذاق شاعری کی بھی کایا پلٹ گئی ہے۔ ہاں اب آپ دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوں۔ شکریہ۔ اب میں اپنے اس شعر کو کیا کہوں۔

ہوں خفائی کے مقابل میں ظہوری غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

پہلی زندگی میں دوسروں کی شہرت کے کھیل دیکھے تھے۔ مرنے کے بعد اپنی شہرت کے کھیل دیکھ رہا ہوں وہ زندگی کی چیٹر تھی یہ موت کی ہے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا،

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس مرقع چغتائی کو کیا کہوں۔ اگر میرے اشعار تصویر کے نیچے نہ لکھے ہوتے تو میں بھی ان تصویروں کو نہ سمجھتا خیر تو ان لکیروں اور رنگوں سے میرے شعروں کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔ نہ دیوان غالب ہوتا نہ تصویر بنانے والا اپنا یہ کمال دکھا سکتا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بہر حال غزل کے مطلب کو تصویر کے پردوں سے ظاہر کرنے کی ادا کو میں کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا۔ زیادہ تر تصویریں بے لباس ہیں

ق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

خیر اتنا تو ہوا کہ "چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط" ایک جگہ کر دئے گئے۔ حسینوں کے خط یعنی ان کی شوخ طبیعت اُن کے چنچل مزاج کی وہ تصویریں جو میرے اشعار میں اکثر دکھائی دیتی ہیں اور یوں تو حسینوں کے خطوط بھی معلوم۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
ہم جانتے ہیں جو وہ لکھیں گے جواب میں

خیر مشہور ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا۔ میرا وہ فارسی کلام جس کا ہندوستان میں جواب نہیں تھا وہ اس دوکان

میں نظر نہیں آتا۔ میرے چند اشعار سے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اور ممکن ہے آج کل کے لوگوں کو بھی یہ دھوکا ہو کہ میں نے اپنی شہرت کی ساری وجہ اپنے فارسی کلام کو جانا تھا اور اُردو کی بڑائی کو میں نہیں سمجھا تھا۔ یہ ایک مزیدار دھوکا ہے۔ اُردو آگے بڑھ کر کیا کچھ ہونے والی تھی۔ اسی کی جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ میرے اُردو کلام کے چند شعر جن میں فارسی زیادہ تھی۔ لوگ لے اُڑے تھے اور یہ نہ دیکھ سکے تھے کہ میں نے غزل کو کتنی چنچل، کتنی ٹکسالی، کتنی چٹیلی، کتنی جیتی جاگتی، بولتی چالتی چیز بنا دی تھی۔ اگر میں اُردو کی اہمیت کو نہ سمجھتا تو اپنے ان خطوط کو جن میں میں نے چٹھی کو بات چیت بنا دیا تھا اس احتیاط اور اس اہتمام سے بچا کر نہ رکھتا۔ قریب قریب سب سے چھوٹا اُردو دیوان میں نے چھوڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ سب سے زیادہ میرے ہی اشعار لوگوں کی زبان پر ہوں گے۔ اب یہاں مجھے بہت دیر ہو چکی۔ کتاب بیچنے والا بھی اپنے دلیل کیا کہتا ہوگا۔ یہ ایک اخبار رکھا ہوا ہے۔ کیوں بھئی اس پر آج ہی کی تاریخ ہے نا؟ اچھا تو آج ۲۳ جون ۳۸ء ہے مجھے کچھ یاد آتا ہے کہ میں ۱۸۶۹ء تک زندہ تھا۔ اُس کے بعد دوسری دنیا کی زندگی تھی اور اُس میں ماہ و سال کہاں، آج اس دنیا سے گئے ہوئے ستّر برس ہونے کو آئے۔ اتنے بڑے عرصہ میں، میں محض اپنی شہرت اور کامیابی کا حال جان کر خیر، ایک طرح خوش تو ہوں۔ لیکن یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں کہ ہندوستان میں اب کیسی شاعری ہو رہی ہے۔ کوئی کتب خانہ تو پاس ہوگا۔ لوگ کسی ہارڈنگ لائبریری کا پتہ دے رہے ہیں۔ اچھا دیکھوں یہاں کیا ہے۔ داغ، امیر، حالی اکبر، اقبال، حسرت موہانی، جگر، اصغر، [illegible] عزیز، چکبست اور دوسرے شعراء کے مجموعے یہاں نظر آ رہے ہیں، اُن میں داغ اور امیر کو تو میں پچھلی زندگی ہی میں جانتا تھا۔ حالی تو میرے سب سے ہونہار شاگردوں میں تھے اکبر سے بیسیوں برس پہلے اس دوسری دنیا میں ملا تھا جہاں سے خود آیا ہوں اور جہاں تمام مرے ہوئے شعراء کے ساتھ یہ سب بزم سخن کی رونق بن گئے ہیں۔ وہاں اکبر کا ساتھ چھوڑنے کو تو جی نہیں چاہتا تھا اور اقبال تو ابھی ابھی وہاں پہونچے ہیں۔ اس شخص کی شہرت وہاں برسوں پہلے پہونچ چکی تھی اور فرشتوں کی زبانوں پر اقبال کے نغمے برسوں پہلے سے تھے۔ میں نے اُردو میں جس طرح کی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی، شاعری کو جو عظمت دینا چاہی تھی۔ میری یہ کوشش اقبال ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ حسرت موہانی کا کلام دیکھا۔ مومن، [illegible] شخصی کا نام اس کلام سے چمک گیا۔ جگر، اصغر، شاد، عزیز، چکبست، اور سرور جہاں آبادی ان سب کی شاعری اپنی اپنی جگہ اونچی ہے لیکن کہیں کہیں روک تھام اور گہری نظر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھوں یہ یاس یگانہ کون شخص ہے اور اسکی آیات وجدانی میں کیا ہے۔ شعر تو جاندار ہیں بیان کا طریقہ بھی کہیں کہیں اُستادانہ ہے۔ آتش کی گرمائی اور تیزی بھی مل جاتی ہے لیکن غالب کا نام اس شخص پر بھوت کی طرح سوار ہے خیر۔ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" — مرزا قتیل کی یاد تازہ ہو گئی۔ غالب نہ جانے کتنے شاعروں کی دکھتی ہوئی رگ ہے۔ میں اُردو میں مسلسل نظم کی ترقی دیکھ کر خوش ہوں

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل ہو یا نظم سنجیدگی، مذاق کی پاکیزگی اور گری ہوئی باتوں سے بچنا بھی وہ خوبیاں ہیں جو شاعری کو پیغمبری کا درجہ دیتی ہیں ہاں کچھ عجیب اور غلط باتیں بھی میر سے بعد کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک صاحب غالب کی جانشینی کا دعویٰ یوں کرتے ہیں کہ جس طرح میر کے ستاسی برس بعد غالب کا زمانہ آیا اسی طرح غالب کے ستاسی برس بعد وہ پیدا ہوئے۔ حالانکہ ہر وقت اور میرے زمانہ کے ۸۷ برس بعد بھی بیوقوف دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں اپنے کچھ اچھے کچھ بُرے اشعار کو لوگ الہام بھی بتانے لگے ہیں۔ اپنی غلط اور بے ڈھنگی نقالی بھی دیکھتا ہوں بہت ہو رہی ہے۔ مہمل فارسی ترکیبیں۔ ایک رسمی قسم کی مشکل پسندی، لفظ پرستی اور شعریت سے معرا بلند آہنگی اور اظہار علمیت یہاں تک کہ غیر موزوں کلام کو بھی شاعری بتانا یہ سب باتیں بھی آج کل کے شعراء میں آگئی ہیں۔ میں اُردو نثر اور اُردو رسالوں اور اخباروں کی کثرت اور آب و تاب کو دیکھ کر بھی خوش ہوں۔ رقعات غالب گویا اس بات کی پیشین گوئی تھے ــــ یہ سب صحیح، لیکن دلی کی پچھلی صحبتیں یاد آگئیں اور دل کو تڑپا گئیں۔ اب نہ ذوق ہیں نہ مومن نہ شیفتہ نہ حالی نہ داغ نہ مجروح نہ انور۔ خیر شعر و شاعری ہی تو ساری زندگی نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ملک پھر جاگ رہا ہے۔ اس کی تمام قومیں ملکر ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اپنا شعر مجھے یاد آیا

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

میری نظریں یہ بھی دیکھ کر خوش ہیں کہ انگریزوں کی تہذیب انکے علم و فن سے فایدہ اُٹھاتے ہوئے بھی ہندوستان اپنی تہذیب کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا ہے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اب شام ہو رہی ہے۔ میں صرف ایک پل کے لئے اس دنیا میں آیا تھا۔ شاید مجھے آئے ابھی کچھ وقت نہیں ہوا اور پل مارتے میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ دوسری دنیا کا ایک پل اس دنیا کی ایک صدی کے برابر ہوتا ہے۔ ہم اہل عدم ایک پل میں جو کچھ دیکھ لیتے ہیں دنیا میں اُسکے لئے اک عمر چاہئے۔ اب نہ وہ دلی ہے نہ ستر برس پہلے کا زمانہ۔ نہ مرزا سہرگوپال تفتہ ہیں کہ اس بے سروسامانی میں میری پیاس بجھائیں۔ اب تو قرض کی بھی نہیں پی سکتے۔ اخباروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب شراب اس ملک میں بند ہونے والی ہے

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نرسد

ہندوستان بہت بدل چکا ہے۔ لیکن اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتا ہے ابھی باقی ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

فیر خراب سے نشاط اور خوشی کس کافر کو درکار ہے

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے ــ اور وہ بیخودی مجھ پر چھا چکی ہے۔ دنیا کے حسن کے کرشمے دیکھ کر میں اسی تماشہ کو قیامت کہتا ہوں۔ میں خاک ہو چکا تھا

بجز پرواز نالۂ شوق کیا باقی رہا ہوگا قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

پھر آنکھ کھل گئی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ریاستوں کے مطالبات آزادی

اور

آئین وفاق

آئینِ وفاق کے نفاذ کی راہ میں ہم کو اسوقت سب سے بڑے دو پتھر حایل نظر آتے ہیں۔ ایک برطانوی ہند کا یہ مطالبہ کہ جب تک جدید ایکٹ میں بعض معقول تبدیلیاں نہ کی جائیں وہ اس کے قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا اور دوسرا ریاستوں کا یہ اصرار کہ جب تک ان کی آزادی و خود مختاری کا فیصلہ نہ ہو جائے وہ شرکت کے لئے طیار نہیں ہو سکتیں

برطانوی ہند میں جس جماعت کی طرف سے شدید اختلاف ظاہر کیا جا رہا ہے وہ کانگرس ہے اور اس لحاظ سے کہ ملک میں اکثریت اسی جماعت کی ہے، یہ اختلاف آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن چونکہ یہ راز غالباً اب راز نہیں رہا کہ اس اختلاف کی اخلاقی و معنوی حیثیت بہت کمزور ہے اور اگر گاندھی جی اعلانِ وفاق کے وقت تک زندہ رہے (اور بظاہر ان کے زندہ نہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی) تو آخر آخر کانگرس ضرور شرکتِ وفاق کے لئے آمادہ ہو جائے گی اس لئے حکومت کو اس طرف سے اطمینان ہو گیا ہے، رہگیا رئیسوں اور ریاستوں کا معاملہ سو اس کا فیصلہ بھی آخر کار وہی ہوگا جو حکومت چاہتی ہے یہ اور بات ہے کہ آزادی و محکومی کی جو غیر ضروری بحث اسوقت چھڑ گئی ہے اس سے وفاق کے نفاذ میں کچھ تاخیر پیدا ہو جائے۔

ہندوستانی ریاستیں آج سے نہیں بلکہ بہت قدیم زمانہ سے یہاں پائی جاتی ہیں۔ اشوک کے زمانے میں بھی یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے راجہ پائے جاتے تھے اور چندر گپتا کے عہد حکومت میں بھی، ہرش کا سیاسی نظام بھی ریاستوں کے وجود سے خالی نہ تھا اور جب چینی سیاح یوانگ شانگ یہاں آیا تو اسوقت بھی ریاستیں یہاں موجود تھیں۔ لیکن صحیح معنے میں آزادی یا خود مختاری جس چیز کا نام ہے وہ ریاستوں کو اس وقت بھی حاصل نہ تھی۔ جب مسلمانوں کی حکومت شروع ہوئی تو اسوقت بھی یہاں کے رؤسا و فرمانروایان اسلام کو اپنا بادشاہ تسلیم کرتے تھے، خصوصیت کے ساتھ مغلوں کے زمانہ میں کہ اسوقت تو مرکزی حکومت کا دباؤ ان پر تقریباً اتنا ہی پایا جاتا تھا، جتنا اسوقت۔ ان کی خود مختاری کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا چنانچہ کوئی رئیس اپنا جانشین بھی بغیر بادشاہ کی اجازت کے مقرر نہیں کر سکتا تھا

جب دولت مغلیہ پر زوال آیا تو رئیسوں نے اپنے آپ کو آزاد سمجھنا شروع کیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری تک تقریباً سب کے سب خود مختار ہو گئے، لیکن اس آزادی و خود مختاری کی عمر بہت تھوڑی ثابت ہوئی، کیونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ ریاستوں کی آزادی بھی کم ہوتی گئی اور باہمد گر جو معاہدے ہوئے ان میں ریاستوں کی محکومیت ہی کا پلہ جھکا ہوا ہوتا تھا مثلاً ۱۸۱۹ء کے معاہدۂ اُدے پور کی رو سے راجہ، کمپنی کا محکوم ہو گیا اور ۱۸۴۴ء میں ہولکر کی گدی کے لئے گود لینے کا سوال اس شرط پر منظور کیا گیا کہ وہ حکومت برطانیہ کو اپنا حاکم سمجھتا رہے

تاریخی حیثیت سے ریاستوں کے نشو و نما پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب چارلس دوم کے زمانہ میں کمپنی کو غیر عیسائی طاقتوں سے صلح و جنگ کا اختیار دیا گیا تو کمپنی نے سب سے پہلے ۱۶۲۳ء میں راجہ ٹراونکور سے معاہدہ کیا، اس کی رو سے کمپنی نے سامانِ جنگ رکھنے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ دوسرا معاہدہ ۱۷۳۰ء میں (Savantavadi) سے ہوا جو (Angria) کے بحری قزاقوں کے استیصال کے لئے عمل میں آیا تھا، اسی طرح کا ایک معاہدہ ۱۷۳۴ء میں ریاست جنجیرا سے ہوا۔ لیکن یہ تمام معاہدے چھوٹے چھوٹے سرداروں سے ہوئے تھے جنھیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی

جنگ پلاسی کے بعد کمپنی اور حیدر آباد کے معاہدہ نے جو ۱۷۵۹ء میں ہوا تھا، کمپنی کے اختیارات میں بہت اضافہ کر دیا۔ اسوقت کمپنی کو مرہٹوں، فرانسیسیوں اور آصف جاہ کی طرف سے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ان ریاستوں سے جو کمپنی کے علاقہ سے متصل تھیں (Subsidiary Alliance) کرے۔ چنانچہ صحیح معنے میں سب سے پہلا معاہدہ اس قسم کا نواب اودھ سے ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی فوجیں لکھنؤ میں فاتحانہ داخل ہو چکی تھیں اور اگر کمپنی چاہتی تو لکھنؤ کو اپنے قبضہ میں کر لیتی، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے کمپنی نے ایسا نہ کیا اور شجاع الدولہ کو اودھ کے تخت پر اس شرط کے ساتھ بحال رکھا کہ نواب اُس فوج کے مصارف برداشت کرے گا جو کمپنی کو اس کی مدد کے لئے رکھنا پڑے گی

اس معاہدہ کی رو سے نواب وزیر اودھ اندرونی معاملات میں خود مختار تھا، لیکن جوں جوں کمپنی کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا، اس کی حیثیت محکوم کی سی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ہیسٹنگز کے زمانہ میں وزیر پورے طور پر انگریزی حکومت کا تابع ہو گیا اور اس نے کمپنی کو معاہدوں میں رد و بدل کا پورا اختیار دیدیا۔ اس کے بعد بنارس کے معاہدہ کی رو سے اودھ کی حیثیت ایک صوبہ کی سی ہو گئی اور پھر کارنوالس اور جان شور کے بعد نواب کے اختیارات بالکل سلب ہو گئے۔ اس کے بعد جب مارکوئس ولزلی گورنر جنرل ہو کر آئے تو وزیر سے دوآبہ کا علاقہ چھین کر کمپنی کی حکومت میں شامل کر لیا گیا اور گورنر جنرل کو نواب کے اندرونی معاملات میں بھی دخل دینے کا حق حاصل ہو گیا

کرناٹک کی تاریخ بھی ایسی ہی ہے۔ نواب ارکاٹ کو کمپنی کی نگرانی میں گدی پر بٹھایا گیا اور اندرونی معاملات میں اس کو بالکل آزاد کیا گیا یہاں تک کہ شاہ انگلستان کی طرف سے ایک ایلچی وہاں رہا کرتا تھا، لیکن بعد کو میسور کی طاقت کا خاتمہ

ہونے کے بعد کرناٹک پر بھی قبضہ کر لیا گیا

ولزلی کے زمانہ میں اعانتی عہد ناموں (Subsidiary Alliance) کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور یہی مناسب سمجھا گیا کہ دیسی ریاستوں کے بقا سے انگریزی حکومت کو بہت مدد ملے گی، چنانچہ نظام، پیشوا، ہولکر اور راجپوتانہ کی بعض ریاستوں سے اسی طرز عمل کے تحت معاہدے کئے گئے۔ ۱۷۶۶ء میں نظام کا معاہدہ اور اس کے بعد سندھیا اور بھونسلا کا معاہدہ اور پھر ۱۸۰۲ء میں گیکواڑ کا معاہدہ سب اسی قسم کے اعانتی معاہدے تھے

ان تمام عہد ناموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت بظاہر ایسی ہی تھی جیسی خود مختار حکومتوں کے معاہدے کی ہونی چاہئے لیکن یہ عہد و پیمان زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوا۔

ولزلی کے زمانہ تک تو حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ وہ اس پالیسی کے خلاف تھا کہ ریاستوں کے اندرونی نظم و نسق میں مداخلت کر کے ان کو کمزور بنا دیا جائے لیکن اس کے بعد بارلو اور کارنوالس کے زمانہ میں یہ پالیسی بالکل بدل گئی اور پھر ولزلی کے زمانہ کے عہد ناموں کو تقریباً کالعدم کر دیا گیا

اس کے بعد میسٹنگز کا زمانہ آیا۔ یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں بالکل برطانوی ملوکیت قایم ہو جائے، اس لئے تمام قدیم معاہدوں کو بدل کر رکھ دیا اور اعانتی عہد ناموں سے جو پوزیشن ریاستوں کا قایم ہو چکا تھا اس کی جگہ (Feudal army System) نے لیلی اور کمپنی تمام ہندوستان کی حاکم مطلق بن گئی۔ اب چونکہ کمپنی طاقتور ہو گئی تھی اور اسے اب ریاستوں کی مدد کی ضرورت نہ تھی اس لئے اس وقت کے تمام معاہدے محض برطانیہ کے وقار کو دوبالا کرنے کے لئے تھے۔ چنانچہ راجپوتانہ کی ریاستوں سے اسوقت جتنے معاہدے ہوئے ان سب کا مقصود ریاستوں کا محکوم بنانا تھا نہ کہ ان سے اتحاد پیدا کرنا۔ یہی حال وسط ہند کی ریاستوں کا ہوا کہ سوائے اورچھا، دتیا اور سمتھر کے باقی سب کو اسناد، معافیاں یا اقرار ناموں سے ٹالا دیا گیا۔ الغرض اس طرح ۴۵ ریاستیں کمپنی کی محکوم ہو گئیں

کاٹھیاوار کی ریاستوں سے براہ راست معاہدے نہیں کئے گئے بلکہ گیکواڑ کی ریاست کی وساطت سے کئے گئے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بالکل برطانوی حکومت کے تحت میں آگئیں۔ اس کے بعد پنجاب کی چھوٹی ریاستوں کے اختیارات محدود کر کے ان کو جاگیردارانہ حیثیت دیدی گئی

کشمیر کی حکومت گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کی گئی لیکن شرط یہ تھی کہ اس کے ورثاء نرینہ میں سے کوئی تخت نشین ہوا کرے گا اور اس کا فیصلہ انگریزی حکومت کرے گی۔ اس طرح گویا کشمیر کو بھی اپنا محکوم بنا لیا۔ اس کے بعد لارڈ ڈلہاوزی نے تو کھلم کھلا ریاستوں کو انگریزی حکومت میں شامل کرنا شروع کر دیا اور کسی نہ کسی بہانہ سے تمام ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جن کا انتظام خراب تھا ضبط کر لیا

الغرض یہ واقعہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں بھی معاہدوں کا لحاظ نہیں کیا گیا اور کمپنی کے ٹوٹنے کے بعد

جب ہندوستان تاج برطانیہ سے متعلق ہوگیا، ہمیشہ معاہدات کا مفہوم، حکومت ہند کے مصالح سیاسی کے لحاظ سے بدلتا رہا اور رفتہ رفتہ رئیسوں کی آزادی محدود ہوتی گئی

اس میں شک نہیں، کہ ہندوستان کی ریاستیں اپنی جغرافی، مالی و سیاسی حیثیت سے مختلف مدارج رکھتی ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ بعض اہم ریاستوں کے معاہدات اپنے مفہوم کے لحاظ سے اب بھی کافی اہمیت رکھتے ہیں اور ان کی بنا پر رئیسوں کو آزادی کے مطالبہ کا حق پہونچتا ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ عملی نقطۂ نظر سے معاہدات کا مفہوم ہمیشہ حکومت کی پالیسی کے لحاظ سے بدلتا رہا ہے اور اس سے قبل کبھی کسی ریاست کو ہمت نہیں ہوئی کہ وہ قوت بالادست کو معاہدوں کی طرف متوجہ کر سکتی، کیونکہ یہ بالکل بے نتیجہ بات تھی

پھر جب معاہدوں کی ترمیم و تنسیخ، ان کے مفہوم کا تغیر و تبدل کمپنی کے زمانہ سے لیکر اسوقت تک تاریخی حقیقت بھی رکھتا ہے اور سیاسی واقعیت بھی، تو پھر اب آئین جدید کے نفاذ کے وقت ریاستوں کا یہ مطالبہ کہ ان کی خود مختاری و آزادی کو بحال رکھا جائے کوئی معنے نہیں رکھتا، اس سے قبل ہی وہ کب آزاد و خود مختار تھے کہ وفاقی طرزِ حکومت میں اس کا سوال اُٹھایا جائے

میں ریاستوں کے اس اصرار یا انکار کو جب اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں کہ اگر قوت بالادست آج یہ فیصلہ کرے کہ ریاستوں کو مٹا کر برطانوی ہند کے صوبوں سے ان کے علاقوں کو ملا دینا چاہیئے، تو ریاستیں کیا کریں گی کیا وہ متفقہ قوت کے ساتھ قوتِ بالادست سے جنگ کریں گی اور کیا اس جنگ میں وہ کامیاب ہو جائیں گی۔ ریاستوں کا مسئلہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس میں برطانوی ہند کی آبادی کو بھی کوئی خاص ہمدردی ان سے نہیں ہے بلکہ وہ خود یہ چاہتی ہے کہ کسی طرح ریاستوں کا وجود ختم ہو جائے، اس لئے ملک بھی ریاستوں کا طرفدار نہیں ہو سکتا اور قوت بالادست پر کوئی دباؤ ایسا نہیں پہونچ سکتا جو اسے ریاستوں کی بقا کا طرفدار بنا دے

پھر جب حالات یہ ہیں تو ریاستوں کے تمام موجودہ مطالبات، محض اس لئے کہ قوتِ بالادست کو برطانوی ہند کے مقابلہ میں اپنا پہلو تہی بنانے کے لئے ان کو ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے، بالکل کچے دھاگے کا سہارا ہے

برطانوی پالیسی وقت و حالات کے سانچہ میں ڈھل جایا کرتی ہے اور ہمیشہ اس مطالبہ کے سامنے سر جھکا دیتی ہے جس کی پشت پر کوئی انقلابی تحریک کام کر رہی ہے۔ پھر اگر ہندوستان اسوقت مستعمراتی آزادی پر قناعت کے لئے طیار ہے تو یہ یقیناً برطانیہ کے اس اندیشہ سے بہت کم ہے، جس کے لئے وہ اس سے بھی کچھ زیادہ دینے کے لئے طیار ہو سکتا تھا جو اسوقت دیا جا رہا ہے اور بالکل ممکن ہے کہ اس سودے میں ریاستیں بالکل ختم ہی ہو جاتیں۔ بہرحال موجودہ حالات میں ریاستوں کو سمجھنا چاہیئے کہ وفاقی حکومت میں جس نوع کی آزادی انھیں مل رہی ہے وہ نہ صرف یہ کہ غنیمت ہے بلکہ حالات کے اقتضا کو دیکھتے ہوئے بہت زیادہ ہے

اس سے قبل ریاستیں جس چیز کو خود مختاری سے تعبیر کیا کرتی تھیں وہ حکومت ہند کے محکمۂ سیاسیات کے نظریہ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ نہ وہاں معاہدات کو کوئی پوچھتا تھا، نہ خدمات وفاداری کو۔ معاملہ ۔ نہ بزور و نہ بہ زاری نہ بہ زری آید۔ کا تھا۔ وفاقی حکومت میں محکمۂ سیاسیات کی اس گرفت سے ریاستوں کو چھٹکارا مل رہا ہے اور براہ راست نمائندۂ تاج سے تعلق پیدا ہو رہا ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ریاستوں کو اس پر وفاق کا ممنون ہونا چاہئے اور اگر بعض مسایل میں وفاقی حکومت کو ریاستوں کے اندرونی خود مختار حاصل ہو جائے تو بھی اس کو گوارا کر لینا چاہئے

کمپنی کے زمانہ میں ڈائرکٹروں اور پھر گورنر جنرلوں کی مرضی کے مطابق ریاستوں کی حالت بدلتی رہی، اس کے بعد بھی ملکی مطالبات و ضروریات کے لحاظ سے وائسرائے نے اپنی پالیسی ریاستوں کے ساتھ جداگانہ مقرر کی، اس لئے اب کہ حکومت کی نوعیت ہی بالکل بدل رہی ہے، ریاستیں کیونکر یہ توقع کر سکتی ہیں کہ ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ جدید حکومت اپنی ضروریات کے لحاظ سے مجبور ہے کہ وہ ایک آل انڈیا نظام حکومت اختیار کرے جس میں ریاستوں کی شرکت ضروری ہو پھر اب یہ ریاستوں کی مرضی ہے خواہ وہ خوشی سے ان شرایط کو منظور کر لیں جو یقیناً انکے لئے کسی طرح مضرت رساں نہیں ہیں، یا جبر و اکراہ کے ساتھ ۔ پہلی صورت میں برطانوی ہند کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا امکان ہے اور دوسری صورت میں یہ بھی نہیں۔

"نگار" کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجۂ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دو دو تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں۔ قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں:۔

(۱۹۲۲ء) ستمبر ۴؍۔ (۱۹۲۶ء) جنوری، جون، نومبر ۵؍ فی پرچہ۔ (۱۹۲۷ء) اپریل، مئی و جون ۴؍ فی پرچہ (۱۹۲۹ء) دسمبر ۵؍۔ (۱۹۳۰ء) مئی ۴؍۔ (۱۹۳۱ء) جولائی تا دسمبر ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۲ء) فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل) ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۳ء) فروری، جولائی و اکتوبر ۴؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۴ء) مارچ ۴؍ (۱۹۳۵ء) نومبر ۵؍ (۱۹۳۶ء) فروری، مارچ، اپریل، جون، نومبر، دسمبر ۵؍ فی پرچہ۔ (۱۹۳۷ء) مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست۔ اکتوبر، نومبر و دسمبر ۸؍ فی پرچہ۔

منیجر نگار لکھنؤ

اُردو ادب اور مقالہ نگاری[1]

اُردو نثر اگر اپنی پیدائش کے لئے نہیں تو اپنے ارتقاء اور نشوونما کے لئے ضرور انگریزی ادب کی مرہون منت ہے گو محققین نے اب اُردو نثر کی بنیاد دکن میں چودھویں صدی عیسوی سے رکھی ہے اور ثبوت کے لئے دکن کی قدیم نثر کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں اور اس سے پیشتر کی تحقیقات نے بتایا تھا کہ نثر کی ابتداء ۱۷۳۲ء سے شمالی ہند میں فصلی کے مقدمہ دہ مجلس سے ہوئی تھی لیکن حقیقتاً اُردو نثر کی صحیح پیدائش فورٹ ولیم کالج اور گلکرائسٹ کے دم سے وابستہ ہے اور اسی ماحول کے زیر اثر میر امن نے وہ باغ لگایا اور وہ بہار دکھائی کہ "جو اس کو پڑھیگا گویا باغ کی سیر کرے گا بلکہ باغ کو آفت خزاں بھی ہے اور اس کو نہیں یہ ہمیشہ سرسبز رہیگا"

اپنے بچپن کے ماحول سے نکلکر اُردو نثر مختلف ماحول اور مختلف فضاؤں میں پلتی بڑھتی رہی۔ لکھنؤ میں سرور کے ہاتھوں انتہا سے زیادہ مسجع و مقفیٰ ہوئی۔ غالب نے اسکو سادہ و شوخ بنا دیا۔ سرشار کے یہاں اس کے حسن میں نکھار پیدا ہوا۔ سرسید، آزاد، حالی، نذیر، ذکاء اللہ، شبلی کی محبت بھری آغوش میں شباب کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی اور پھر رسوا، نیاز پریم چند، حسن نظامی، ابوالکلام، عبدالحق، سرور، زور، چغتائی وغیرہ کی تیز نفسیوں اور گرم گرم صحبتوں نے تو اس کو سراپا شباب بنا دیا۔ پھر یہ سب کچھ ہوا۔ اس کی فضا اس کے ساز، اس کے نغمے سب ہندوستانی اور "اُردو" ہی کے رہے مگر پھر بھی ان نغمات کی لے انگریزی ادب کی "نشر کردہ تیز تیز" برقی شعاؤں سے برابر متاثر رہی۔ اسی لئے اُردو نے گو ان تاثرات کے ماتحت نثر کی کوئی صنف بغیر خامہ فرسائی کے نہ چھوڑی مگر وہ اصناف جن میں ادب مستقلاً طور پر قایم ہے، مقالہ نگاری۔ تاریخ۔ ڈراما اور تنقید ہی ہیں۔

ہمارے یہاں "مقالہ" کے مفہوم میں مختلف اقسام کے مضامین شامل کر لئے جاتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ مضامین جن کو ہم مقالہ کے صحیح مفہوم میں کچھ کھینچ تان کر اور کسی حد تک ایمانداری کے ساتھ لا سکتے ہیں، زیادہ تر انگریزی مقالوں کے ترجمے ہیں۔ اور یحنبل مقالوں میں، چراغ علی، محسن الملک۔ حالی۔ سرسید وغیرہ کے وہ مضامین شامل ہیں جو

---

[1] انگریزی لفظ (Essay) کا ترجمہ ہے۔

تہذیب الاخلاق، میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے تھے (اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق نے اس لحاظ سے اُردو کے لئے وہی کام کیا جو انگریزی کے لئے (Spectator & Tatler) نے ایک خاص وقت میں کیا تھا) نذیر احمد و سرسید کے لکچر بھی ایک مقالہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور آزاد۔ سرسید۔ حالی۔ نواب محسن الملک کے مختلف مذہبی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین اور دلگداز۔ مخزن۔ ادیب۔ اُردو۔ نگار اور ہمایوں وغیرہ کے مختلف مضامین بھی اسی زمرہ میں شمار کئے جا سکتے ہیں

موجودہ دور میں عام رجحان صحافت۔ افسانہ اور تنقیدی مضامین کی طرف زیادہ ہے تنقیدی یا تاریخی مضامین لکھنے والوں کے موضوعات گوناگوں مسایل پر حاوی ہوتے ہیں مثلاً سائنس۔ سینما۔ فلسفہ۔ سیاسیات وغیرہ اور انھیں کو عام طور پر "مقالہ" سمجھا جاتا ہے

قبل اس کے کہ ہم اُردو کے ان مضامین پر تنقید کریں، دیکھنا چاہئے کہ دراصل مقالہ (Essay) کیا چیز ہے؟ انگریزی ادب میں جہاں سے یہ چیز آئی ہے، اس کا رتبہ اور معیار کیا ہے؟ اور اس صنف میں شروع سے اب تک زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا تغیرات ہوئے اور اس کا قدیم و جدید مفہوم کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ انگریزی زبان میں غالباً بجز لفظ (Gentleman) کسی لفظ کا بھی اتنا ناموزوں اور لامحدود استعمال نہیں ہوا جتنا کہ لفظ (Essay) کا!! ایک مشہور فلاسفر کی کتاب کے لئے یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور ایک طالب علم کی مشقی تحریر کے لئے بھی یہی شاید صحیح ہے کہ دونوں جگہ یہ لفظ ایک "کوشش و فکر" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور شاید اس کے لغوی معنی میں بھی یہی۔ لیکن حقیقتاً اس لفظ کو استعمال کرتے وقت یہ مفہوم ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا (Essay) لکھنے کی قابلیت عمر کی پختگی کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ محض ادبی ذوق یا زبان پر قابو حاصل کر لینا کافی نہیں

مثال کے طور پر بیکن کو لیجئے، وہ انگریزی کے ابتدائی دور کے ادبی کمالات کا نمونۂ مجسم تھا۔ ایک خاص طریقۂ اظہار خیال اور فلاسفی کا ناخدا تھا۔ لاجواب امثال استعمال کرتا تھا۔ سب کچھ تھا اور اب بھی ہے۔ مگر بحیثیت مقالہ نگار (Essayist) اب اس پر (Addison & Lamb) وغیرہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ گو اس کو فنی کمال حاصل تھا۔ دنیا کا تجربہ بھی تھا۔ فلسفیانہ دماغ بھی تھا مگر اس کے پاس وہ ذہنیت نہ تھی جو مقالہ نگاری کے لئے ضروری ہے

زندگی کی پیچیدگیوں اور رازوں کو سمجھنا اور اس کو ظاہر کر سکنا یہ ہے اصل میں معیار "مقالہ نگاری" کا اور یہ اہلیت بغیر پختگی عمر کے پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس میں اُستواری آتی ہے

مقالہ نگاری اور اصل عمر، تجربہ، اور مشاہدہ کا نچوڑ ہے جو صرف انسانی عمر کے ہیجان انگیز حصہ کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے

گو یہ صاف اور شفاف پانی کی طرح چمکتا ہے پھر بھی اس میں انسانی زندگی لہراتی رہتی ہے اس میں ایک خاص مہک ہوتی ہے، ایک خاص مزہ ہوتا ہے۔ اس کے پینے سے سوئی ہوئی یا بھولی ہوئی باتیں یاد آجاتی ہیں اس کی خوشبو کی لپٹیں دل کو گرما دیتی ہیں ایک خاص، دماغی کیف حاصل ہوتا ہے اور سوئے ہوئے خیالات بیدار ہو جاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے کہ مقالہ نگاری ایک سکون آمیز لطیف شے ہے لیکن قبل اس کے کہ کوئی انسان اس سکون آمیز شراب کو نچوڑ کر کسی اور کو پلائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو پہلے خود حاصل کرے۔ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو چالیس سال کی عمر سے قبل اس قسم کا سکون حاصل کر سکیں۔ بہت سے تو عمر بھر محروم رہتے ہیں مگر جو حاصل کر لیتا ہے اور دوسروں کو دے سکتا ہے وہی درحقیقت مقالہ نگار کہلاتا ہے

انسان کی عمر میں شباب کا ہیجان انگیز دور گزر جانے کے بعد وہ دور آتا ہے جب وہ کسی نظریہ کو پہلے سے اپنے دماغ میں قائم کرکے اس پر بحث و مناظرہ نہیں کرتا اور نہ کسی موضوع کو بغیر اچھی طرح سمجھے ہوئے اس پر گفتگو کرتا ہے بلکہ وہ اس ہنگامۂ عالم میں بغیر اپنے پارٹ کی فکر کئے ہوئے ایک تماشہ دیکھنے والے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ اس کا جوشِ زندگی کم ہو جاتا ہے بلکہ اب وہ زندگی کی ولولہ انگیزیوں کو سمجھنا چاہتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ زندگی کے سربستہ راز اس پر افشا ہونے لگتے ہیں اور وہ صرف "خود" نہیں رہ جاتا بلکہ "دنیا" بن جاتا ہے "شخصیت" کے اس پھیلاؤ کی وجہ سے اس کے مزاج میں قوتِ برداشت حلم اور خطاپوشی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، صبر و سکون کی ابدی مسرتیں اسکو حاصل ہو جاتی ہیں اور ہر چیز کے متعلق آزادانہ بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے

انگریزی ادب کے بہترین مضمون نگار مثلاً لیمب۔ ایڈیسن۔ کاڈلے اور موجودہ دور میں چسٹرٹن اور ماکس بیرم وغیرہ سب کی زندگی پر یہ قول صادق آتا ہے

انگریزی ادب میں مقالہ نگاری کے ارتقا و ترقی پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مقالہ نگاری کا یہ مفہوم مختلف درمیانی منزلوں سے گزرنے کے بعد متعین ہوا ہے

طوالت کے خوف سے اس کو واضح کرنے کے لئے تمام تبدیلیاں نہیں دکھائی جا سکتیں۔ مگر پھر بھی اتنا کہے بغیر کام نہیں چلیگا کہ پندرھویں صدی کے اختتام اور سولھویں صدی کے آغاز میں بیکن اگرچہ (Essay) کو (Montaigne) کے نمونہ پر لانا چاہتا تھا مگر پھر بھی اس کے زمانہ میں (Essay) کو "تصویر پریشاں" (Dispersed Medi tation) کہا جاتا تھا۔ بیکن اور اس کے متبعین نے زیادہ تر خارجی انداز بیان اختیار کیا جسے (Impersonal note) کہتے ہیں

سترھویں صدی میں (Sir Thomas Brown) نے مضمون میں نفس مضمون پر کم اور اسٹائل پر زیادہ زور دیا اور اس صدی کے اختتام پر (Cowley) نے داخلی انداز بیان (Personal note) پیدا کر دیا اور

ڈرائیڈن نے تنقید بھی شروع کردی

اٹھارھویں صدی میں ایڈیسن اور اسٹیل نے مضمون میں داخلی پہلو پر زور دیا۔ مگر طرز تحریر اور موضوع میں تبدیلی آگئی۔ سوشل مسایل بھی اس میں شامل کئے گئے اور طنزیہ انداز بھی۔ گولڈ اسمتھ نے سوانح اور تنقید کو ملا دیا۔

اسی زمانہ میں ہیوم نے مضامین میں سنجیدگی۔ خیال آفرینی پیدا کردی

میکالے نے مضامین میں تاریخ۔ تنقید اور سوانح تینوں کو ملا دیا۔ کارلائل نے "شخصیت نوازی" شروع کردی۔

اُنیسویں صدی میں (Lockhart, Leigh Hunt, De Quincy) نے مضامین کو ٹھوس اور عالمانہ بنا دیا لیکن اس زمانہ کے شعراء نے جو مضمون نگار بھی تھے۔ اس کو کلاسزم اور مشکل پسندی کے قیود سے آزاد کردیا۔ خصوصاً (Lamb) نے داخلی اور ذاتی انداز بیان کو بہت نمایاں کردیا اور اپنی تحریروں میں باوجود اپنی و نیز اپنی بہن کی پُر درد اور مصیبت زدہ زندگی کے اپنی ذاتی خوبیوں کے وہ مرقعے اپنے مضامین میں پیش کئے جن کا جواب آج تک انگریزی ادب پیش نہ کرسکا۔ چنانچہ اسی وقت سے کہا جاتا ہے کہ "The style is the man" Hazlitt وغیرہ نے لیمب کی اس سادگی۔ صفائی۔ فطرت شناسی اور اپنے ذاتی تاثرات سے کام لینے کے طریقہ کو قایم رکھا

اُنیسویں صدی کے اختتام سے اب تک اس قسم کے مضامین کو بڑی ہر دلعزیزی حاصل ہوئی اور لاتعداد مقالہ نگار پیدا ہوئے۔ موجودہ زمانہ میں (Belloc, Max Burbhom, Chesterton, Lucas) اور (E. V. Lucas) سب سے زیادہ مشہور ہیں

موجودہ دور میں خاص طور پر (Personal Essay) کا دور دورہ ہے (Impersonal essay) کو صرف ناپسند ہی نہیں کیا جاتا بلکہ لوگ اس کو اب (Essay) کہنا بھی گوارا نہیں کرتے (Impersonal essay) کیا ہے؟ "ایک خوبصورت پیرائے میں مفہوم کو ایک مقررہ قانون، قاعدہ اور منطق کے ساتھ وسعت دینا اور اپنے آپ کو پس پشت ڈالدینا تاکہ ذاتی تاثرات و جذبات اس میں شامل نہ ہوسکیں

(Personal essay) اس کے بالکل متضاد ہے: "اسی میں مضمون نگار مضمون کا تابع نہیں رہتا بلکہ اس کو اپنا تابع رکھتا ہے وہ اس کو جس طرح چاہتا ہے پیش کردیتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے ساتھ کھیلتا ہے اور اس میں سے جتنا چاہتا ہے منتخب کرکے اپنے کیفیات و احساسات کے مطابق پیش کردیتا ہے"

اس قسم کے مقالہ نگاروں کا مقصد اپنے مقالہ کو نہیں بلکہ اپنی ذات کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جب کوئی ہمارا محبوب ہم سے گفتگو کرتا ہے تو ہم اس کی باتیں موضوع کے لحاظ سے نہیں سنتے بلکہ اس لئے کہ وہ ہمارا عزیز ہے اور ہم کو اس کی ذات سے وابستگی ہے۔ ممکن ہے کہ ہم اس کی رائے سے موافقت نہ کریں لیکن ہمیں اس کی آواز، اسکے خیال اور محسوسات کے علم سے ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے

اسی لئے مقالہ نگار کا کام یہ ہے کہ جو کچھ کہے اچھوتے پیرایہ میں اور نئے انداز سے کہے۔ ہماری توجہ کو ہماری زندگی اور دنیا کی ان باتوں کی طرف مبذول کرے، جن کو ہم کسی وجہ سے نظر انداز کر چکے ہیں۔ زندگی کے معمولی معمولی واقعات میں اثر اور سوز و گداز پیدا کرے اور ہم کو بتائے کہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اپنے اندر خاص لطف رکھتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں جب تک مقالہ نگار کو خود ان سب چیزوں سے پوری واقفیت اور دلچسپی نہ ہو اس کے لئے اس کی قوتِ مشاہدہ اور احساس کو بہت تیز ہونا چاہئے۔ دنیا کی ہر شے میں اسکی نگاہوں کو ایک خاص کیف۔ دلچسپی اور حسن کی تلاش ہونی چاہئے اور جہاں یہ ملجائے اس سے پوری طرح متاثر ہونا چاہئے، اپنے تاثر کو خیالات میں تبدیل کرنا چاہئے اور پھر ان کو الفاظ میں، الغرض مقالہ نگار کے لئے قوتِ احساس اور غور و فکر بہت ضروری ہے۔ آج کل دنیا کے بڑے بڑے مقالہ نگار ایسے موضوع لیتے ہیں جو بظاہر نہایت حقیر۔ معمولی۔ بھدے اور مضحکہ انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر وہ اپنے دماغ و قلم کی سحر کاری سے زور۔ تاثیر۔ مزاح اور سوز و گداز کا ایک ایسا خوشنما جال پھیلا دیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، یہی کمال ہے (Personal essay) کا!!

اس معیار کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:۔

(۱) اس میں تصنع و آورد کی جھلک نہ آنے پائے۔ نہ صرف اسٹائیل سادہ اور نیچرل بلکہ دماغی کیفیت بھی پرسکون اور خاموش ہونا چاہئے۔ (۲) اس میں کسی چیز کے لئے کاوش، کاشائبہ نہ آنے پائے نہ زیادہ جوش ہو نہ زیادہ زور اور نہ زیادہ جستجو۔ (۳) ہلکی ہلکی شوخی و مزاح نگاری بھی ہو اور انسانی ہمدردی کی جھلک بھی۔ (۴) دنیا کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے مقالہ نگار کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں غم و نشاط۔ اشک و تبسم۔ قنوطیت و رجائیت دونوں لازم و ملزوم ہیں مقالہ نگار کا کام اصلاح یا دنیا کی از سر نو تعمیر کرنا نہیں، اس کا کام دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا اور ہر بات سے متاثر ہونا ہے

اس اُصول کو سامنے رکھ کر اگر ہم اُردو کے مقالوں کو دیکھیں تو ہم کو کہنا پڑے گا کہ ایسے مقالے ہمارے یہاں اگر مفقود نہیں تو کم ضرور ہیں۔ تہذیب الاخلاق اور اس کے مقالہ نگاروں کا مدعا زیادہ تر قوم کی گری ہوئی مذہبی، تمدنی اور سیاسی حالت کو سنبھالنا تھا۔ ان کی ہر کوشش مسلمانوں کی بیداری کے لئے ہوتی تھی۔ ایسے مضامین زیادہ ہوتے تھے جن سے پرانی باتوں اور قیود سے آزادی کا سبق پڑھانا مقصود ہوتا تھا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقالہ نگار کا مقصد اصلاح نہیں ہونا چاہئے اس میں کسی قسم کا پروپیگنڈا یا جوش یا مطلب براری کے لئے جد و جہد نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں ہلکا سا مزاح۔ سکون، سادگی اور بے لوث تنقید زندگی ہونی چاہئے۔ کیا ان لوگوں کے مضامین میں یہ سب باتیں تھیں؟ شاید نہیں

موجودہ زمانہ میں لوگ افسانہ۔ تنقیدی مضامین اور صحافت کی طرف زیادہ مائل ہیں، مقالہ نگاری کی طرف سے سب غافل ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے ادیب عام طور پر مقالہ نگاری کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہیں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

شریف (بی۔ اے)

سیاسیات یورپ

(۶)

اسپین کی خانہ جنگی

۱۸ جولائی ۱۹۳۶ء کو اسپین میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اور صورت یہ ہوئی کہ بعض فوجی افسران نے جو وہاں کی جمہوری حکومت کے خلاف اور فاسسٹی خیال کے موافق تھے، بغاوت کردی اور دفعتاً سارے جزیرہ نمائے اسپین میں یہ آگ بھڑک اٹھی۔ جرمنی اور اٹلی نے باغی فوج کی مدد کی اور روس نے حکومت اسپین کی (لیکن کچھ دنوں بعد اور وہ بھی بہت کم)

اس جنگ میں خونریزی کے جو مناظر دیکھنے میں آئے ان کی مثال دورِ حاضر کی کسی جنگ میں اسوقت تک نظر نہیں آئی، یوں سمجھئے کہ پہلے ہی سال ۵ لاکھ آدمی جان سے مارے گئے اور متعدد شہر خاک سیاہ کردئے گئے۔ چونکہ جرمنی اور اٹلی کھلم کھلا مداخلت کررہے تھے اور بحر روم میں باغی فوج کی آبدوز کشتیاں بے تعلق حکومتوں کے تجارتی جہازوں کو بھی تباہ کرنے سے باز نہ آتی تھیں، اس لئے عالمگیر جنگ کا خطرہ سامنے تھا اور سارا یورپ نہایت تشویشناک انداز سے ان تمام حالات کا مطالعہ کررہا تھا

جس اختلاف نے اس جنگ کو رونما کیا اس کے عناصر متعدد تھے۔ یہ جنگ گویا لڑائی ہے غریبوں کی امراء کے ساتھ مزدوروں کی فوجوں کے ساتھ، کسانوں کی زمینداروں کے ساتھ اور جمہوریت کی فاسسزم کے ساتھ۔ جنرل فرانکو کے طرفداروں میں ہم کو افسران، جاگیرداران، شاہ پسند جماعت، سرمایہ دار اور فاسسٹ نظر آتے ہیں اور ان کی عسکری قوت مشتمل ہے جرمن، اطالوی اور ریف و مراکش کے سپاہیوں پر۔ حکومت کے طرفداروں میں جمہوریت پسند، سوشلسٹ، کمیونسٹ انارکسٹ اور تمام طبقۂ متوسط شامل ہے اور اس کی فوج میں سوائے عوام کے اور کوئی نہیں ہے یہ جنگ گویا حکومت اسپین کے دست راست و دست چپ کی لڑائی ہے جس میں دست راست والی جماعت جنرل فرانکو کی ہے اور دست چپ والی عوام کی۔

اسپین اپنی شخصی حکومت کے دوران میں حد درجہ پست حالت میں تھا (بالکل ویسا ہی جیسے روس زار کے زمانہ میں) اور یورپ بھر میں پرتگال چھوڑ کر جہل کا اوسط (۵۰ فی صدی) سب سے زیادہ یہیں تھا بیسویں صدی میں یہاں کی ملوکیت

الفانسو سیزدہم کے ہاتھ میں تھی جس کی تین جماعتیں طرفدار تھیں، ایک طبقہ امراء کا، دوسرا فوج کا، تیسرا اہل کلیسا کا۔ اسپین کی آبادی ۲، فی صدی زراعت پیشہ ہے، لیکن ان میں شاید پندرہ بیس ہزار کاشتکاروں کے پاس کچھ زمین ہو تو ہو، ورنہ سب زمینداروں کے قبضہ میں تھی، چنانچہ نواب البا، البجیم کے برابر حصۂ زمین کا مالک تھا۔ پھر ان زمینداروں کی حالت یہ تھی کہ وہ کاشتکاروں سے لگان تو ایک ایک کوڑی وصول کر لیتے تھے، لیکن زمین کے تردد پر ایک پیسہ صرف نہ کرتے تھے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی قابل کاشت زمین چراگاہ میں تبدیل ہو گئی اور زرعی حصہ بھی صرف یک فصلی ہو کر رہ گیا

اب اسی کے ساتھ اس کے فوجی مصارف کو دیکھئے۔ یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ الفانسو کے زمانہ میں اسپین پر جتنا بار فوج کا تھا، دنیا کے کسی ملک پر نہیں تھا۔ ۳۶۵ تو صرف جنرلوں کی تعداد تھی اور ۲۱ ہزار افسران کی (حالانکہ ۱۹۱۴ء میں جب جرمنی نے جنگ شروع کی ہے اس کی فوج میں بھی ۲۱ ہزار افسر نہ تھے) فوج کو اقطاعی حقوق حاصل تھے اور فوجی عدالتوں ہی میں ملکی معاملات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ یہ تھا ناقابل برداشت بوجھ اسپین کی فوج کا جس نے ۱۶۴۰ء کے بعد سے اسوقت تک کوئی کارنمایاں انجام نہ دیا تھا

اب اہل کلیسہ کی قوت کو دیکھئے۔ وہاں ۶۰ ہزار پادری تھے جن میں سے ہر ایک کی معقول تنخواہ مقرر تھی۔ یہ سب امراء اور افسران فوج سے ملے ہوئے تھے اور وہاں کی تجارت اور کاروبار پر چھائے ہوئے تھے، سیاسی معاملات میں بھی ان کا اثر بڑا زبردست تھا اور مکاری، دسیسہ کاری اور اخلاقی انحطاط کی نہایت شرمناک صورتیں اس جماعت کی وجہ سے ملک بھر میں پیدا ہو گئی تھیں۔ آخرکار ۱۸۳۱ء میں اسپین کی ملوکیت خود اپنے بوجھ سے دبکر فنا ہو گئی اور وہ خاندان جو پانچ صدی سے یہاں حکمراں چلا آرہا تھا ہمیشہ کے لئے معزول کر دیا گیا۔ دنیا کی تاریخ میں صرف اسپین ہی کا یہ انقلاب ایسا انقلاب تھا جس میں ایک قطرہ خون کسی کا ضایع نہ ہوا اور چشم زدن میں بساط ملوکیت اُلٹ کر رکھدی گئی

زوال ملوکیت کے بعد اسپین میں جمہوریت قایم ہوئی، جو اوسط طبقہ کے اہل علم پر مشتمل تھی۔ یعنی اب سیاست اہل کلیسہ یا فوجی افسران کے ہاتھ میں نہ تھی، بلکہ مصنفوں، انشاپردازوں، ڈاکٹروں اور پروفیسروں کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے جس جدید کانسٹی ٹیوشن کو مرتب کیا اس کا نصب العین یہ تھا کہ حکومت کو کلیسہ سے علٰحدہ کر لیا جائے، ابتدائی تعلیم لازم کر دی جائے عورتوں کو رائے دینے کا حق دیا جائے اور مزدوروں اور کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے اور ہر شخص کو نہایت آزادی سے نکتہ چینی کا موقعہ دیا جائے، لیکن چونکہ ان لوگوں کو نظم و نسق کا تجربہ نہ تھا اور عملی سیاست سے بیگانہ تھے، اسلئے نظریوں کے لحاظ سے تو سب کچھ ہوا لیکن عملاً بہت کم۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امراء، اہل کلیسہ اور افسران فوج مخالفین جمہوریت کا استیصال نہ ہو سکا اور ان کی قوت باقی رہی

۱۹۳۲ء میں جنرل سنجرجو نے امراء کی سفارش سے جمہوریت کے خلاف بغاوت کی اور جب یہ بغاوت دبا دی گئی تو حکومت نے تمام امراء کی جایدادیں ضبط کرنے کا حکم صادر کیا، لیکن یہ حکم کاغذ ہی تک محدود رہا اور اس کی تعمیل نہ ہو سکی۔

اہلِ کلیسہ کے قبضہ میں اس وقت دس کروڑ پونڈ قیمت کی جایداد تھی اور یہ سب جایداد ضبط بھی کرلی گئی لیکن قبضہ بدستور اہلِ کلیسہ کا رہا۔ فوجی اصلاح کے سلسلہ میں بجز اس کے کہ دس ہزار افسروں کو پنشن دیدی گئی اور کچھ نہ کیا گیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ازانہ برسرِ اقتدار تھا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ اپنے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس طرح دست چپ کی جمہوریت ڈھائی سال کے بعد ختم ہوگئی اور دستِ راست کی جماعتیں برسرِ اقتدار ہوگئیں۔ یہ بھی جمہوریت کے موافق تھیں لیکن صرف نظریوں کی حد تک اور سوشلسٹ کی مخالف۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء میں سوشلسٹ جماعت نے بغاوت کردی اور شدید خونریزی کے بعد تقریباً ۳ ہزار سوشلسٹ جیل بھیجدیئے گئے

دست راست کی حکومت کو جب تین سال ہوچکے انتخاب کا زمانہ آیا، لیکن چونکہ لوگوں کے دلوں سے دست چپ کی حکومت کی یاد محو نہ ہوئی جو ۱۹۳۱ء سے لیکر ۱۹۳۳ء تک برسرِ اقتدار رہی تھی، اس لئے کثرت رائے سے پھر دستِ چپ کی حکومت کو اقتدار حاصل ہوگیا۔ یہ واقعہ فروری ۱۹۳۶ء کا ہے۔ لیکن چھ مہینے کے بعد ہی جولائی ۱۹۳۶ء میں جنرل فرانکو نے بغاوت کردی اور وہ خانہ جنگی شروع ہوگئی جس کی نظیر تاریخ یورپ میں نہیں ملتی

جیسا کہ ابھی ہم نے ظاہر کیا ہے کثرت رائے سے دستِ چپ کی جماعتیں برسرِ اقتدار ضرور ہوگئی تھیں، لیکن ملک میں امن وسکون مفقود تھا، چنانچہ ۶ ماہ کے اندر سیکڑوں سیاسی افراد قتل ہوگئے اور اس میں شک نہیں کہ فاسسٹ جماعت نے بدامنی پیدا کرنے میں زیادہ حصہ لیا۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں دستِ چپ کا ایک فوجی افسر مارا گیا اور ادھر سے جواب میں دستِ راست کے ایک لیڈر کو قتل کردیا گیا اس قتل کا ہونا تھا کہ دفعتاً آگ بھڑک اٹھی اور ۱۸ جولائی کو فوجوں نے بغاوت کردی۔ جنرل فرانکو جو اسوقت جزایر کناری کا گورنر تھا فوراً مراکش پہونچا اور اطالیہ کے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے وہاں سے عربوں کی فوج لے آیا جو چاروں طرف اسپین پر چھاگئی۔ ہم اس جگہ جنگ کے واقعات سے بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ انکا علم سب کو ہے، لیکن یوروپ کے دیگر ممالک نے اس جنگ کو کس نگاہ سے دیکھا اس کا بیان ضروری ہے — عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اطالیہ اور جرمنی کا ہاتھ اس جنگ میں شامل ہے اور یہ خیال بالکل درست ہے، جنگ سے پہلے ہی اطالیہ کے متعدد ہوائی جہاز مراکش پہونچ گئے اور جب جنگ شروع ہوئی تو اسی ہوائی جہاز اور روانہ ہوئے۔ اس کے دوسرے مہینے جرمن طیارے، جرمن آبدوز اور جرمن شباہ کن کشتیاں سب جنرل فرانکو کی مدد کو پہونچ گئے اور رفتہ رفتہ ان دونوں ملکوں نے سامان حرب، طیارہ شکن توپوں اور فوجوں سے کھلم کھلا فرانکو کی مدد شروع کردی۔

جنرل فرانکو اس مدد کے قبول کرنے پر اس لئے مجبور تھا کہ اسپین کی آبادی سے وہ کوئی سپاہی بھرتی نہ کرسکتا تھا اور اطالیہ وجرمنی اس لئے مدد کررہے تھے کہ جنرل فرانکو کی کامیابی فاسسٹ جماعت کی کامیابی تھی گویا یہ جنگ فاسزم اور اشتراکیت کی جنگ تھی — علاوہ اس کے اطالیہ اور جرمنی یوں بھی عرصہ سے اسپین میں اپنے اثرات قایم کرنے کی فکر میں تھے تاکہ یہاں کی معدنیات وپیداوار سے فایدہ اٹھایا جاسکے، چنانچہ آغاز جنگ سے ۶ ماہ قبل ہی تانبہ اور لوہا بکثرت جرمنی بھیجا جارہا تھا تاکہ وہ وقت پر مدد دے۔ اطالیہ اور جرمنی نے جنرل فرانکو کی جتنی مدد کی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تقریباً دس ہزار جرمن ماہرین فن اور

ستر ہزار اطالوی سپاہی ۱۹۳۷ء میں جنرل فرانکو کے شریک کار تھے۔ روس اور فرانس، حالات کو دیکھ کر جل رہے تھے لیکن وہ کچھ کر نہ سکے روس نے کچھ ہوائی جہاز حکومت اسپین کی مدد کیلئے ضرور روانہ کئے لیکن وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہوئے، فرانس اتنا بھی نہ کر سکا۔ بین الاقوامی قانون یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں بغاوت ہو جائے تو حکومت بغاوت فرو کرنے کے لئے آزادی سے اسلحہ و سامان حرب خرید سکتی ہے، لیکن حکومت اسپین اس قانون سے فایدہ نہ اُٹھا سکی۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ جنرل فرانکو نے ناکہ بندی کر رکھی تھی اور دوسرا یہ کہ دول یورپ نے "عدم مداخلت" کا معاہدہ کر لیا اور حکومت بیرونی امداد سے بالکل محروم ہو گئی۔ پھر اس عدم مداخلت کا اثر جنرل فرانکو پر بھی پڑتا جا رہا ہے لیکن اول تو جرمنی و اطالیہ اس معاہدہ سے قبل ہی کافی مدد کر چکے تھے، دوسرے انھوں نے اس معاہدہ کی کوئی پرواہ نہیں کی اور بعد کو بھی امداد کا سلسلہ جاری رکھا۔ عدم داخلت کی تحریک فرانس اور برطانیہ نے ملکر تجویز کی تھی تاکہ لڑائی جلد ختم ہو جائے، لیکن اس تجویز نے سات مہینے گفت و شنود میں لے لئے کیونکہ جرمنی، اطالیہ اور پرتگال اسکے مخالف تھے، آخر کار اپریل میں جا کر مشکل سے بین الاقوامی بحری ناکہ بندی کی تجویز پر ۲۷ ملکوں نے دستخط کئے۔ فرانس کبھی فرانکو کی کامیابی کو پسند نہیں کر سکتا کیونکہ اسپین میں فاسسٹی جماعت کی کامیابی کے معنے یہ ہیں کہ اگر کبھی اطالیہ یا جرمنی سے اس کی لڑائی ہو تو اسے ایک تیسرا محاذ قایم کرنا پڑے، علاوہ اس کے فرانس یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر اسپین میں نازی یا فاسسٹی حکومت قایم ہو گئی تو اسکے مقبوضات افریقہ خطرہ میں پڑ جائیں گے اور وہاں کی فوجوں کو وہ آسانی سے فرانس نہ لا سکے گا۔ جنرل فرانکو کی کامیابی سے فرانس کی طرح انگریزوں کو بھی خطرہ ہے کیونکہ اس طرح بحر روم میں فاسسٹی اقتدار بڑھ جائے گا اور ان کے استحکامات جبرالٹر ضعیف ہو جائیں گے، لیکن ساتھ ہی ساتھ چونکہ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ اسپین میں اشتراکیت یا بالشویت قایم ہو کر سرمایہ داری کو نقصان پہونچے اس لئے وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ جنرل فرانکو جیت جائے تو اچھا ہے۔ برطانیہ کی یہی دورخی پالیسی تھی جس کی وجہ سے "عدم مداخلت" کی تجویز کو اس نے عرصہ تک جھلائے رکھا اور اب بھی جرمنی و اطالیہ کی زیادتیوں اور گستاخیوں کو برابر برداشت کرتا چلا آ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر جنگ کے خیال سے برطانیہ بہت گھبراتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر وہ اُلجھ گیا تو پھر سوال صرف بحر روم کی حفاظت و اقتدار کا نہ ہوگا، بلکہ بحر ہند کا بھی ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ کوئی زبردست انقلاب خود اندرون ملک بھی ایسا رونما ہو جو اس کو نہ مغرب کا رکھے نہ مشرق کا۔ اطالیہ اور جرمنی سواحل اسپین پر برطانیہ کی جتنی توہین کر رہے ہیں کسی سے مخفی نہیں، جہاز پر جہاز ان کے ڈبوتے چلے جا رہے ہیں، لیکن دنیا کی اس سب سے بڑی طاقت کے سر پر جوں تک نہیں رینگتی، اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ کمزور ہے یا دشمن کا جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتا، بلکہ صرف یہ کہ اس آغاز کا انجام اسے بہت تاریک نظر آتا ہے

مسٹر چیمبرلین وزیر اعظم برطانیہ کی اس نرم پالیسی کے خلاف سخت نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اس کی یہی پالیسی انگلستان کو اس طوفان سے محفوظ رکھ سکتی ہے جو روم اور برلن سے گزر کر اسوقت تمام وسط یورپ کے پہاڑوں سے ٹکرا رہا ہے۔

مولانا نسبتی واسطی تھانیسری

(۱)

ادب فارسی کے ایک گم شدہ مقدس صحیفہ کی بازیافت

پیش لفظ جس طرح اکثر اہم و مفید معلومات اتفاقاً حاصل ہو جاتی ہیں اسی طرح کلام نسبتی کی بازیافت بھی محض اتفاقی امر ہے۔ میں کھڈ کے کتب خانۂ مولوی صاحب کی فہرست مخطوطات مرتب کر رہا تھا کہ یہ نایاب کلیات میرے ہاتھ لگا۔ جس وقت میں نے اس کو دیکھا تو نسبتی کا نام پڑھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ غیر شاعرانہ تخلص کس کا ہے۔ میں نے اپنے دماغ پر زور دیا، شعرالعجم، میخانۂ عبدالنبی قزوینی۔ سخندانِ پارس۔ نگارستان پارس اور تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی ایک ایک کو دیکھا لیکن نسبتی کا نام کہیں نظر نہ آیا، میں نے سوچا کہ خود کلیات سے پتہ چلانا چاہئے۔ اسوقت اس کام کے لئے میرے پاس پندرہ بیس منٹ تھے اس مختصر سے عرصہ میں خود نسبتی کے متعلق تو خیر کیا معلوم ہو سکتا تھا لیکن اشعار نے جو اثر دل پر پیدا کیا اسے کبھی نہیں بھول سکتا

اس کے بعد ایک مضمون لکھنے کے سلسلہ میں کلیاتِ سودا دیکھ رہا تھا کہ رسالہ عبرۃ الغافلین کی تمہید میں فیضی، غنی۔ نسبتی۔ ناصر علی۔ بیدل۔ خانِ آرزو اور میر شمس الدین فقیر کے اسمار گرامی نظر آئے۔ مرزا رفیع نے انھیں فارسی گو ہندی شعراء لکھا تھا۔ اتنا معلوم ہو جانے کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا نیاز کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔ جب آپ سے عرض کی تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ مجموعۂ استفسارات و جوابات جلد اول دیکھئے۔ خوشی خوشی مجموعہ لیا۔ اس میں تذکرہ روز روشن کی مدد سے نسبتی کے مختصر سوانح حیات درج تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر تھا کہ "کلام نسبتی" اب نایاب ہے۔ یہ پڑھ کر اور اپنے پاس کلیاتِ نسبتی دیکھ کر میں پھولا نہ سمایا اور اس خیال سے کہ اس کی اشاعت کر سکوں۔ لاہور گیا، وہاں کے عمائد علم و ادب سے ملا۔ کلام نسبتی دکھایا مگر کامیابی نہ ہوئی، اہلِ مطابع نے کہا کہ "اب ایسی چیزوں کی مانگ نہیں" اور علماء نے کہا کہ فارسی پڑھنے والے ہندوستان میں ہیں کتنے؟ - آخر کار جب اشاعت کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا تو مایوس ہو کر میں نے نگار و نیاز کے دامن میں پناہ لی۔ اس بات کا ظاہر نہ کرنا کفرانِ نعمت ہوگا۔ کہ اس زمانہ میں جب کہ فارسی زبان دم توڑتی نظر آتی ہے۔ اگر فارسی ادب و شعر کا ملجا و ماوا کوئی ہے تو وہ صرف نگار اور نیاز کی ذات ستودہ صفات ہے۔ ان کی ذرہ نوازی نے مجھے اس قابل بنایا ہے کہ نسبتی کو ناظرین نگار سے روشناس کرانے کی جرأت کرتا ہوں۔

نام ونسب

نام دارد گرچہ در گم گشتگی عنقا ولے
ننگ و نام و شہرت او ہمچو نام من کجا (نسبتی)

تذکرہ لکھنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ لیکن ان تذکروں کا عام انداز یہ ہوتا ہے کہ شاعر کے سوانح حیات کے متعلق چند معمولی باتیں بیان کر دیجاتی ہیں اور پھر انتخاب اشعار دیدیا جاتا ہے۔ ورق پر ورق اُلٹتے چلے جایئے تاریخی اہمیت رکھنے والی ایک بات بھی نظر نہ آئے گی۔ درحقیقت ان کتابوں کے لکھنے کا مقصود کسی شاعر کے سوانح حیات قلمبند کرنا نہ ہوتا تھا، بلکہ تذکرہ کے پردہ میں خود اپنی انشا پردازی کا کمال دکھایا جاتا تھا۔ مصنف کس پایہ کا نثر نویس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام تذکروں میں شعراء کے اشعار زیادہ اور حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں اگر کوئی بات ہوتی بھی ہے تو اس کی حیثیت اضافی یا ثانوی ہوتی ہے حقیقی نہیں

مولٰنا نسبتی کا ذکر۔ عمل صالح مصنفہ محمد صالح کنبوہ۔ کلمات الشعرا محمد افضل سرخوش۔ مجمع النفائس خان آرزو۔ مخزن الغرائب احمد علی سندیلوی۔ شمع انجمن نواب صدیق حسن خاں بھوپال۔ سفینۂ بے خبر میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی۔ گل رعنا شفیق اورنگ آبادی اور روز روشن مظفر حسین صبا میں ملتا ہے۔ مگر بجز روز روشن اور کسی میں ان کا نام درج نہیں سب نے تخلص پر اکتفا کیا ہے

روز روشن میں جو ۱۲۹۶ھ کی تصنیف ہے۔ یوں مرقوم ہے:۔

نسبتی۔ شاہ محمد صالح متوطن قصبۂ تھانیسر از سادات عالی درجات ۔۔۔ بود۔ در عہد جہانگیر بادشاہ از بطون بشہود رسیدہ

شاہ محمد صالح النسبتی تھانیسر کے رہنے والے عالی مقام سید تھے آپ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں کتم عدم سے عالم وجود میں آئے

مگر معلوم نہیں، صبا کی تحقیقات کی بنیاد کیا ہے۔ کیونکہ ماخذ کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اوپر ان کتابوں کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ سب روز روشن سے پہلے کی تصانیف ہیں۔ اور اپنی قدامت کے لحاظ سے روز روشن پر فوقیت رکھتی ہیں، خان آرزو نے اپنے تذکرہ میں نسبتی کے حالات ان کے بھتیجے عزت سے دریافت کر کے درج کئے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

برادر زادۂ او عزت تخلص می کرد۔ با فقیر آشنا بود می گفت مولٰنا از سادات است پدرش از ولایت آمدہ در قصبۂ مذکور (تھانیسر) تمدن اختیار نمود

مجھ سے اور اُن کے بھتیجے عزت سے راہ و رسم تھی۔ وہ کہتا تھا۔ مولٰنا سید ہیں۔ ان کے والد نے ولایت سے آکر تھانیسر میں بود و باش اختیار کی

محمد صالح کنبوہ نے (۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۱ء) میں خود نسبتی سے ملاقات کی۔ سرخوش آرزو کا معاصر تھا اور اس کا تذکرہ کلمات الشعرا۔ مجمع النفائس سے قدیم ہے۔ یہ سب لوگ نسبتی کے نام کے متعلق خاموش ہیں۔ بہرحال۔ صبا نے ان کا نام محمد صالح لکھا ہے

وطن خان آرزو کے بیان کے مطابق نسبتی کے والد ایران سے آئے۔ اور نسبتی تھانیسر میں پیدا ہوئے یہیں پلے بڑھے

پروان چڑھے اور سپرد خاک ہوئے

مجمع الغرائب۔ گلِ رعنا۔ سفینۂ بے خبر۔ شمع انجمن۔ کلمات الشعرا۔ عمل صالح اور روز روشن میں انھیں تھانیسری لکھا ہے۔ مرزا سودا بھی انھیں ہندی نژاد کہتے ہیں۔ مگر خود نسبتی کو اس سے انکار ہے، فرماتے ہیں :-

دُر از دریا بر آمد۔ لعل از کاں
ز واسط نسبتی۔ طالب ز آمل
اگرچہ نسبتی از واسطم من
دلِ من طالبِ آمل فتاد است

اس اندرونی شہادت کی موجودگی میں کوئی اور بیان تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا، رہ گئی یہ بات کہ انھیں تھانیسری کیوں کہتے ہیں، سو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ نسبتی نے اپنی ساری زندگی تھانیسر میں بسر کی اس لئے وہ اسی جگہ سے منسوب ہو گئے

یہاں واسط کے متعلق جو نسبتی کا وطن اصلی ہے چند سطریں لکھنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔

"اخبار الدول و آثار الاول" میں لکھا ہے کہ "واسط" بصرہ اور کوفہ کے درمیان ایک شہر ہے، جسے حجاج بن یوسف نے ۸۴ھ میں آباد کیا۔ صاحب قاموس نے واسط نام کے کئی شہروں کا ذکر کیا ہے مثلاً وادی نخلہ میں مکہ کے قریب ایک شہر کا نام "واسط" ہے۔ مضافات بلخ میں ایک شہر واسط ہے۔ جہاں کے دو محدث محمد بن محمد اور بشر بن میمون مشہور ہیں۔ عراق میں ایک شہر ہے جسے حجاج نے دو سال کی مدت میں آباد کرایا وغیرہ وغیرہ" مولانا جوش بلگرامی اپنے ایک مضمون میں جو نگار ۱۹۲۲ء کی اشاعت دسمبر میں شایع ہوا، تحریر فرماتے ہیں :-

"واسطی النسل مسلمان ہندوستان میں دو مقامات پر پھیلے۔ ایک نے بارہہ (مظفر نگر) کو بسایا اور دوسرے نے بلگرام (ہردوئی) کو۔ دونوں ایک ہی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور سید ابو الفرح واسطی کی اولاد ------ سید ابو الفرح کے لئے جب واسط میں عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ تو اپنے چاروں بیٹوں کو لے کر پہلے غزنیں میں پناہ لی۔ غزنیں میں جب جی نہ لگا تو اپنے چھوٹے صاحبزادے سید معز الدین کو ساتھ لے کر واسط لوٹ گئے"

مولانا نسبتی بھی اسی واسط کے رہنے والے معلوم دیتے ہیں۔ جو نواحِ بلخ میں خراسان کا ایک شہر ہے۔ اور جہاں کی دو چیزیں "نیزۂ واسطی" اور "قلم واسطی" بہت مشہور ہیں۔

تعلیم اگرچہ آپ کی تعلیم کا حال معلوم نہیں۔ مگر قیاساً کہا جا سکتا ہے۔ کہ آپ رسمی علوم سے کما حقہ واقف تھے کیونکہ تمام تذکرہ نویسوں نے آپ کو ملا نسبتی اور مولانا نسبتی لکھا ہے۔ آپ جس زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اس میں "ملا" فاضل شخص ہی کو کہا جاتا تھا۔ مثلاً ملا عبد اللہ سلطان پوری (مخدوم الملک)۔ ملا مبارک اللہ (ابو الفضل کا والد) ملا عبد القادر بدایونی۔ ملا فیضی

مذہب

صاحب تذکرہ روز روشن لکھتے ہیں :-

صوفی وصافی مشرب و درویش پاکیزہ مذہب بود بعد سن شعور بفقر و درویشی میل نمودہ و تکیہ بکنارہ گھانیسر بکمال نزہت و صفا ترتیب دادہ، ہمانجا بطاعت و ریاضت مشغول می ماند

بے تعصب، صوفی مرنجاں مرنج اور پاکیزہ مذہب درویش تھے جوانی کے دلول ہی میں فقر و درویشی کا شوق پیدا ہوا تھا، گھانیسر سے باہر ایک کنارہ پر نہایت پاکیزہ اور لطیف تکیہ بنا کر اسی میں طاعت و ریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے

آپ کے کلام سے جہاں آپ کی آزاد منشی اور درویشی کی شہادت ملتی ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف مائل بہ تشیع تھے۔ ایک قصیدہ کی تشبیب میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں کہا ہے فرماتے ہیں :-

چار سو ایست ایں جہان خراب
یک قدم چار راہ نتواں رفت

نہایت لطیف پیرائے میں اپنی شیعیت کا اظہار کرتے ہوئے اہل تسنن پر چوٹ کر گئے ہیں کبھی کبھی وہ غزل میں بھی بے اختیار حضرت علی کی تعریف شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں ان کے قصد و ارادہ کا دخل مطلق معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ شیعہ نہ تھے تو مائل بہ تشیع ضرور تھے

امرائے وقت سے تعلقات

متقدمین و متاخرین خواہ صوفیائے کرام ہوں یا شعرائے عظام اپنے اپنے عہد کے ارباب دول سے کسی نہ کسی رنگ میں ضرور متعلق ہوتے تھے لیکن نسبتی ہمیشہ آزاد رہے۔ شاہزادہ دارا شکوہ ولی عہد شاہجہاں نے، جسے صوفیوں سے دلی محبت تھی اور یہی تصوف پرستی اس کی جان لیکر رہی، آپ کو بلوایا تو آپ نے جواب دیا کہ :-

برول نیامدہ ام ہیچ گہ ز خانۂ خویش
سفر چہ داند عنقا ز آشیانۂ خویش
نمی پرم بہ پر و بال عاریت چوں تیر
نشستہ ام چو کماں روز و شب بخانۂ خویش

اس غزل کے باقی اشعار بھی لطف سے خالی نہیں ہے

ہزار شکر کہ بائے بکام خود نزدیم
گزشت عمر دریں کہنہ آشیانۂ خویش
دگر بدام ہوا و ہوس نمی افتم
کہ سیر خوردہ ام از آب خویش و دانۂ خویش

صاحب روز روشن کا بیان ہے کہ :-

بکدے استغنا بر مزاجش مستولی بود کہ شاہزادۂ دارا شکوہ...

ان کے مزاج پر استغنا اور بے پرواہی کا غلبہ اس قدر تھا

... ہر چند طلب فرمود۔ دے انگشتِ اجابت بر دیدۂ قبول نگذاشت

کہ دارا شکوہ نے بارہا بلوایا۔ مگر آپ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔

مولانا کے ضخیم دیوان میں ایک لفظ تک کسی دنیادار کی تعریف میں نہیں جس سے سعدی ایسے معلم اخلاق دامن ملوث ہوئے بغیر نہ رہ سکا

ایسے بڑے شاعر کا اور اس زمانہ میں جبکہ شعرا کو سونے چاندی سے تولا جاتا تھا، اہل دنیا سے الگ تھلگ رہنا حیرتناک امر ہے۔ شاعر بھی وہ جس کو ولی دشتی بیاضی کے بعد فارسی کا میر تقی میر کہہ سکتے ہیں اور جس کے کلام پر میرزا صائب کا ایسا شاعر عاشق ہو[1]

مرزا صائب در حین توجہ از بکشمیر بمنزلش رفتہ باہم صحبتے داشتہ خیلے بایک دگر خوش بر آمدند بعد ازاں کہ مرزا بایران رفت۔ ہر کہ از می رفت از وے می پرسید برائے ما چہ تحفہ از ہند آوردہ آں کس می گفت۔ چہ تحفہ می خواہی۔ مرزا می فرمود اشعار مولنا نسبتی، (مخزن الغرائب)

مرزا صائب کشمیر جاتے ہوئے ان کے یہاں گئے دونوں خوب گھل مل گئے۔ کئی دنوں تک یہ صحبت گرم رہی بعد ازاں جب مرزا ایران چلے گئے تو جب کبھی کوئی شخص ہندوستان سے ایران جاتا اس سے کہتے میرے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ پوچھتا کیا؟ فرماتے۔ !

مولانا نسبتی کے اشعار، (احمد علی سندیلوی)

---

[1] دیوان غنی کے شارح نے مجمع النفائس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "حالِ صفت کہ شارح در مقدمہ ثانیہ شرح از چند اساتذۂ معتبرہ رحمہم اللہ تعالیٰ نگاشتہ۔ سراج الدین علی خاں آرزو تخلص گوالیاری در تذکرۂ الشعرا مسمی بمجمع النفائس می آرد کہ ملا طاہر غنی کشمیری شاگرد شیخ محسن فانی است گویند چوں کسے از ہند دار دِ ایراں می شد مرحومی مرزا صائب می فرمود کہ برائے ما تحفۂ از ہند آوردۂ ؟ و آں عبارت است از اشعارِ غنی"

جب میں نے یہ بیان پڑھا۔ تو ادب فارسی کے مشہور محقق علامۂ دوراں حافظ محمود خاں صاحب شیرانی لکچرار پنجاب یونیورسٹی لاہور کی خدمت میں ایک عریضہ لکھ کر رفعِ التباس کی درخواست کی۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ:۔ "میں نے مجمع النفائس از سراج الدین علیخاں آرزو الماری میں سے نکلوا کر دیکھا۔ اس میں عیناً وہی عبارت درج ہے۔ جو آپ کہتے ہیں۔ خان آرزو اور احمد علی سندیلوی میں خان آرزو زیادہ ثقہ اور قابلِ اعتبار ہیں جس طرح کہ قدیم بھی ہیں۔ آپ خانِ آرزو کے بیان کو صحیح تسلیم کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ احمد علی کو سہو ہو گیا ہے اور اس نے صائب کا جو بیان غنی کے حق میں تھا، نسبتی کی طرف منتقل کر دیا"

نسبتی اور صائب۔ غنی اور صائب کا ہم عصر ہونا۔ باہمی ملاقاتیں اور کشمیر کی آمد و رفت تذکروں سے ثابت ہے۔ صائب دوسرے اکابر شعرا کا نام جس ادب سے لیتا تھا۔ وہ بھی معلوم ہے۔ اس لئے یہ امر قرینِ قیاس ہے کہ صائب نے نسبتی کے متعلق بھی ایسا ہی فرمایا ہو جیسا کہ غنی کے متعلق۔

البتہ مرزا احسن اللہ[1] مخاطب بہ ظفر خاں احسن تخلص مرزا صائب کے ممدوح سے مولانا کو ضرور تعلق تھا۔ مگر یہ تعلق ایسا تھا۔ جیسے ایک مرشد اور ہادیِ طریقت کو اپنے مرید سے ہوتا ہے۔ "مرزا ظفر خاں احسن ہا دے نسبت راسخہ داشتہ ازیں رو اکثر بہ کشمیر ہم اقامت کردہ" (روز روشن)

شفیق اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ "مولنا نسبتی در فقر صاحب نسبت تام است ۔ ظفر خاں صوبہ دار کشمیر با وے سلوک معتقدانہ داشت (گل رعنا)

اس کے سوا کسی امیر سے ان کا تعلق ثابت نہیں۔ باوجودیکہ مولانا کو ظفر خاں سے گونہ تعلق تھا لیکن اسکی مدح سے زبان قلم کو کبھی آسودہ ہونے نہ دیا

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ظفر خاں اُن سے اس طرح ملتا تھا جیسے کوئی اپنے مرشد سے ملتا ہے۔ ان کے تعلق کی ایک اور وجہ بھی دل میں آتی ہے۔ مولنا فنا فی الشعر تھے اور ظفر خاں "ناقدِ سخن"، علامہ شبلی مرحوم شعر العجم جلد سوم

---

[1] مرزا احسن اللہ مخاطب بہ ظفر خاں رکن السلطنت اور خواجہ ابوالحسن قزوینی کا (پروفیسر آزاد مرحوم نگارستان میں سبزواری لکھتے ہیں) کا بیٹا تھا۔ خواجہ ابوالحسن اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آکر شاہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا۔ جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اسے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان اور منصب پنج ہزاری تفویض ہوا ۱۰۳۳ھ میں کابل کی حکومت بھی وزارت عظمیٰ سے متعلق کرادی گئی اور ظفر خاں باپ کی نیابت میں صوبہ دارِ کابل بنایا گیا۔ شاہ جہاں نے ۱۰۴۲ھ میں ابوالحسن کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا۔ جہاں وہ اسی سال دنیا سے کوچ کر گیا۔ خواجہ کی وفات کے بعد ظفر خاں کو مستقل طور پر کشمیر کی صوبہ داری سہ ہزاری منصب۔ علم اور نقارہ مرحمت ہوا۔ اس نے اپنے ایام حکومت میں تبت فتح کیا۔ علاوہ ازیں کابل کا گورنر رہا۔ شاہجہاں کے ہمراہ دکن کی یلغاروں (۱۰۳۶ھ تا ۱۰۴۱ھ) میں بھی شامل رہا۔ اپنے زمانہ کے چوٹی کے امرا میں شمار ہوتا تھا۔ عالی دماغ۔ بلند فطرت۔ صاحب جوہر اور جوہر شناس عالم تھا۔ نہایت فیاض قدر دانِ علم و فن اور شاعری کا نباض تھا۔ علامہ شبلی مآثر الامرا کے حوالہ سے لکھتے ہیں "ذرہا بر دم ایراں می دود۔ خصوصاً در حق شعرا طرفہ بذل و کرم می فرمود"، الغرض ارباب کمال کی پرورش کرنا فرض سمجھتا تھا ہمیشہ اس کے دربار میں علما۔ اُدبا اور شعرا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ خود شاعر تھا۔ احسن تخلص کرتا تھا۔ علاوہ ازیں شعر کا زبردست نقاد تھا۔ صائب کو صائب بنانا اسی کے فیضِ تربیت کا نتیجہ ہے۔ اس نے شعرا کا ایک عجیب و غریب تذکرہ مرتب کرایا تھا۔ جس میں اپنے ہمعصر شعرا کے سوانح حیات اور منتخب کلام خود شاعر کے اپنے ہاتھ سے لکھوائے تھے۔ ساتھ ہی ہر شاعر کی تصویر تیار کرا کر لگا دی تھی۔ (مآثر الامرا) محمد افضل سرخوش نے اس دلچسپ کتاب کا ایک ورق دیکھا تھا جس پر کلیم کی تصویر تھی۔ آہ۔! یہ نادر کتاب جو بڑے اہتمام سے لکھوائی گئی تھی دست بردِ حوادث کی نذر ہو گئی۔ اگر مل جاتی تو بڑے کام کی چیز تھی (کلمات الشعرا) مرزا صائب جب بسلسلۂ تجارت ہندوستان آیا اور شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوا یہاں ہی ظفر خاں سے واقفیت پیدا ہوئی۔ پھر یہ تعلقات اس قدر بڑھے کہ اب ظفر خاں اور صائب دونوں کے نام اکٹھے لئے جاتے ہیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ ہو)

کے صفحہ ۱۶ پر لکھتے ہیں "ظفر خاں صوبہ دار کشمیر اس رتبہ کا شخص تھا کہ کلیم اور مرزا صائب کو اس کی اُستادی کا اعتراف ہے صائب ایک مدت تک اس کے دربار میں رہا اور اس کی بدولت شاعری میں ترقی کی۔ ظفر خاں اس کے کلام میں موقع بموقع دخل اور تصرف کرتا تھا"۔ نسبتی کے دیوان میں صرف ذیل کے دو شعروں میں ظفر خاں کا نام آیا ہے

نسبتی ماہم زبانی با ظفر خاں کردہ ایم
گفتگوئے ایں غزل زاں ادسرایانا زک است

من دول چو از شوق افغاں کنیم ظفر خاں ۔۔ ظفر خاں ۔ ظفر خاں کنیم

ممکن ہے ان کے کلام کے صفحۂ عالم سے محو ہونے کی بڑی وجہ یہی بے نیازی۔ استغنا۔ زاویہ نشینی اور عزلت گزینی ہو۔۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۱)

صائب نے اس کی تعریف میں پرزور قصاید لکھے۔ احسن کو بھی اس سے بڑی محبت تھی۔ اپنی غزلوں کے اکثر مقطعوں میں صائب کو یاد کرتا ہے ؎

طرز یاراں پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوئی ہائے او از فیضِ طبعِ صائب است

صائب اُسے اپنا اُستاد سمجھتا ہے

حقوقِ تربیت را کہ در ترقی باد زباں کجاست کہ در حضرت فروخوانم
تو ہاں ز دخل بجا مصرعۂ مرا دادی تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
ز دقتِ تو بمعنی چناں رسیدم باریک کہ می تواں بہ دلِ مور کرد پنہانم
چو زلف سنبلِ ابیاتِ من پریشاں بود نہ داشت طرۂ شیرازہ روئے دیوانم

تو غنچہ ساختی اوراق باد بردۂ من
دگر نہ خار نمی ماند از گلستانم

جب والد کی محبت صائب کو کشاں کشاں ایران لے گئی۔ تو وہ وہاں جاتے ہی شاہ عباس ثانی کے دربار میں ملک الشعرا بن گیا۔ مگر ہندوستان کی قدردانی کب بھولنے والی تھی۔ ظفر خاں کی تعریف میں وہاں سے بھی اشعار بھیجا کرتا۔ ایک دفعہ ایک شعر لکھ بھیجا ؎

دور دستاں را باحساں یاد کردن ہمت است
ورنہ بر شاخے بپائے خود ثمر می افگنند

تو ظفر خاں نے پانچ ہزار روپیہ اور بقولِ بعض پانچ ہزار اشرفی بھجوائیں۔ مولانا آزاد نگارستان میں یہ واقعہ ظفر خاں سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر مولانا شبلی نے خزانۂ عامرہ کی روایت سے اسے نواب جعفر خاں وزیر اعظم عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا ہے۔ مگر قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہ سخی مرد ظفر خاں آسن ہی ہوگا

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۳ پر ملاحظہ ہو)

تاریخ شاہد ہے کہ اکثر اہل متعلق بہ دربار شاہی ہونے کے باعث مشہور ہوئے (گو ان کی شہرت چشمک شرار سے زیادہ نہ تھی) اور فضلائے بے مثال اپنی آزاد منشی کے باعث "لا اله صحرا" بنے رہے۔ مجد الدین ہمگر شیخ کے معاصر اور اس دربار سے تعلق رکھتے تھے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۵۲)

اس کی وفات بقول علامہ شبلی ۱۰۷۵ھ میں ہوئی اور خانصاحب مولوی عبدالمقتدر باکی پور پٹنہ کی خدا بخش لائبریری کی عربی فارسی مخطوطات کی فہرست کے مؤلف ۱۰۷۶ھ بتاتے ہیں۔ لیکن مرآۃ کے خیال میں ظفر خاں کی وفات ۱۰۷۴ھ یا ۱۰۷۵ھ میں واقع ہوئی۔

اس نے ۱۰۶۳ھ میں شعر کہنا شروع کیا۔ ۱۰۶۴ھ میں جب وہ شاہجہاں کے ہمراہ دکن گیا تو ایک دیوان مرتب کیا جس کا ایک نسخہ بوڈلین لائبریری میں موجود ہے جس کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ نثر میں ہے اس نسخہ پر راجح شعبان ۱۰۶۳ھ درج ہے۔ مگر یہ دیوان احسن کا ابتدائی کلام ہوگا۔ علامہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے ذاتی کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ دیوان احسن کا موجود ہے جسے میں قلت وقت کے باعث دیکھ نہ سکا۔ آپ نے تو میری خاطر الماریاں کھلوا دی تھیں اگر قصور ہے تو میرا۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ دیوان وہی ابتدائی مجموعہ سخن ہے یا ظفر خاں کے عہد پختگی کا سرمایہ شعر و شاعری۔ علامہ فرماتے تھے دیوان احسن اکثر کتب خانوں میں موجود ہے۔ سرخوش لکھتا ہے کہ ایک دیوان رنگین جس میں چند مثنویاں بھی ہیں اس سے یادگار ہے۔ نواب صدیق حسن خاں صاحب مصنف شمع انجمن نے بھی ان کا ایک دیوان مختصر دیکھا تھا۔ باکی پور لائبریری میں بھی اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:۔

دلم بکوئے تو امید وار می آید — نگاہ دار کہ روزے بکار می آید

در گوشۂ میخانہ ہمیں گفت و شنید است — یاراں برسانید دماغے شب عید است

شاہم بہ دل شکستگی خود کہ پیش من — قدر دل شکستہ چو زلف شکستہ است

گوشۂ چشمے اگر ساقی بمن دارد دریغ است — عمرہا در گوشۂ میخانہ خدمت کردہ ایم

بہ تیغ بے نیازی تا توانی قطع ہستی کن — فلک تا افگند از پا ترا خود پیش دستی کن

بہر کجا کہ روم وصف دوستاں گویم — برائے یار فروشی دکاں نمی باید

ز بہر مستیم کے کار با جام و شراب افتد — مرا از گفتگوئے بادہ سرخوش می تواں کردن

بسکہ بر خاک درش ناصیہ سودیم احسن، — آیۂ سجدہ تواں خواند ز پیشانی ما،

ظفر خاں کا بیٹا محمد طاہر مخاطب بہ عنایت خاں المتخلص آشنا ایک دلچسپ نوجوان تھا۔ اسے انشا پردازی میں کامل دسترس حاصل تھی۔ شاہجہاں نامہ کے مصنفین میں سے ایک ہے اس نے شاہجہاں کے وقایع حکومت ملا حمید وغیرہ کی نسبت زیادہ شگفتہ اور فصیح لکھے ہیں۔ اس نے اپنا دیوان بھی زندگی ہی میں مدون کر لیا تھا شعر میں دقت آفرینی اور مشکل پسندی اسے پسند نہ تھی چنانچہ اس کا قول ہے کہ جو شعر ایک دفعہ پڑھنے سے سمجھ میں نہ آئے اور جس کو سمجھنے کے لئے دماغ پر بوجھ ڈالنا پڑے وہ بے معنی ہے۔ اس کی وفات ۱۰۷۷ھ میں ہوئی۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کا دیوان محفوظ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

درد و درماں را دہد گر عرض عشق او بما — زخم بر داریم و بگذاریم مرہم را بجا،

ناقصاں ہم بر درش چشم طمع دوختہ اند — کو پیوستہ نظر جانب بالا دارد

بہ نشیں بہ گوشۂ اگر آزادۂ ز خلق — پائے شکستہ تو بجائے نرفتہ است

جس سے یہ شیخ کو بتھا۔ آج تو کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ لیکن اسی زمانہ میں فارسی کی ملک الشعرائی جو سعدی کا حق تھا قسمت نے ان کو عنایت کیا تھا

سعد بن ابوبکر سعد زنگی ان کی تعظیم و تکریم شیخ سے زیادہ کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں امامی ایک شاعر تھے زمانہ کی بے بصری نے ان کو بھی شیخ کا حریف بنا دیا تھا" (شعر العجم جلد دوم صفحہ) ۔ یوں ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جنھیں بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے ۔ زمانہ لاکھ مٹائے حق ظاہر ہو کے رہتا ہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان کی ادبی محفلوں میں نسبتی کا نام غرور گونجتا رہا ۔ بجائیکہ ان کا کلام نایاب ہو گیا۔ آخر وہ وقت بھی آگیا جب کہ زمانہ کی سنت جاریہ کے مطابق ان کا گم گشتہ دیوان پھر سے مل گیا۔

معلوم ہوتا ہے ایک شخص سعادت خاں سے (جس کا حال معلوم نہیں ہو سکا) مولانا نسبتی کو قلبی لگاؤ تھا۔ ایک درد آمیز غزل میں اپنی لگاوٹ کا اظہار کرتے ہیں :۔

مگو از ما سعادت خانِ ما را — کہ از نے بشنود افغانِ ما را
خورد چوں بادہ و خواہد کبابے — بیاد آرد دلِ بریانِ ما را
بگو گوشے نہد بر صوتِ بلبل — کہ با گل می زند دستانِ ما را
بہا کن شیوۂ بلبل ۔ کہ دانی — بقدرے قیمتِ افغانِ ما را
بجانت می خورم سوگند جاناں — کہ جاں دادست درد جانِ ما را
چہ شد اکنوں کہ تاثیرے ندارد — اثر با بودہ ات افغانِ ما را
چکد چوں آب زہرابِ جدائی — بیفشاری اگر دامانِ ما را
سرے شوریدہ و جانِ خراسے — چہ می پرسی سر و سامانِ ما را

مگو اے پند گو ما را ملامت
ملامت کن دلِ نادانِ ما را

نہ دست و پا ۔ نہ بال و پر ۔ نہ پرواز — چہ پرسی شوقِ بے سامانِ ما را

ماندہ نسبتی در چشم تر آب
بخوں شاداب کن مژگانِ ما را

وفات نواب صدیق حسن خاں شمع انجمن کے صفحہ ۴۵۹ پر لکھتے ہیں "در اواسط ۱۱۵۵ھ بدار البقا آرامید" "روز روشن" جو اس سے تین سال بعد کی تصنیف ہے اس کی تصدیق کرتا ہے ۔ مولانا نیاز فتحپوری مجموعۂ استفسارات و جوابات جلد اول کے صفحہ ۴۲۹ پر تحریر فرماتے ہیں "گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں آپ کا انتقال ہوا"۔ خانصاحب مولوی عبد المقتدر عربی فارسی مخطوطات کی فہرست جلد سوم میں طاہر نصیر آبادی کے تذکرۃ الشعرا کے

حوالے (جو ۱۰۶۳ھ) کی تصنیف ہے یوں رقم طراز ہیں "نسبتی نے اسوقت وفات پائی جب ظفر خاں احسن ناظم کابل تھا۔

اگر ان سب بیانات پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ طاہر نصیر آبادی کا قول غلط ہے کیونکہ ظفر خاں ۱۰۳۳ھ میں اپنے باپ کی طرف سے کابل کا ناظم تھا۔ پھر ۱۰۴۲ھ میں شاہجہاں نے اسے کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ اس طرح اس کی نظامت کابل کا زمانہ ۱۰۳۹ھ سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ۱۰۳۹ھ میں شاہجہاں کے ساتھ دکن چلا گیا اور واپسی پر (۱۰۴۲ھ) کشمیر کا حاکم بنایا گیا ہے صائب نے کشمیر جاتے ہوئے نسبتی سے ملاقات کی تھی۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ صائب کشمیر سے ہی ایران چلا گیا تھا۔ پھر واپس نہیں آیا۔ صائب کی ملاقات بھی ۱۰۴۱-۴۲ھ کے بعد ہی کا واقعہ ہے۔ مگر کیا نسبتی گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں فوت ہو گئے؟

مولانا نیاز کے بیان کی بنیاد روز روشن کے قول پر قایم ہے جس کی اصل عبارت یوں ہے "وفاتش در اواسط تعداد عشر واقع شد" آپ کو دھوکا ہو گیا اور ۱۱۰۰ھ کے بجائے گیارھویں صدی ہجری لکھ گئے۔ مصنف شمع انجمن نے انھیں شعرائے عالمگیری میں شمار کیا ہے، عالمگیر کا عہد حکومت ۱۰۶۸ھ سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے نسبتی کی وفات گیارھویں صدی ہجری کے وسط میں تسلیم کی جا سکتی ہے۔ نہ ۱۰۳۳ھ اور ۱۰۴۲ھ کے درمیان طاہر نصیر آبادی کے قول کے مطابق

طاہر کے بیان کی تردید ایک اور چشم دید شہادت سے بھی ہوتی ہے۔ محمد صالح کنبوہ مصنف عمل صالح (شاہجہاں نامہ) اپنی کتاب کی دوسری جلد کے صفحہ 743 پر لکھتے ہیں کہ "میں نے ۱۰۶۲ھ مطابق ۱۶۵۱ء میں نسبتی سے تھانیسر کے مقام پر ملاقات کی جب کہ میں لاہور سے واپس ہو رہا تھا" اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ ۱۰۶۲ھ تک نسبتی زندہ تھے۔ نواب صدیق حسن خاں کا بیان "وسط ۱۱۰۰ھ" میں وفات پانا اس لئے غلط ہے کہ طاہر نصیر آبادی نے اپنا تذکرہ (بقول علامہ شبلی) ۱۰۶۳ھ میں مکمل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے تاریخ وفات نسبتی کے متعلق کسی روایت کو بلا تحقیق لے لیا ہو۔ لیکن اس غلطی کا امکان قطعاً ناممکن ہے کہ وہ زندہ نسبتی کو مردہ نسبتی لکھتا۔

لہذا ان کی وفات کا زمانہ ۱۰۶۲ھ اور ۱۰۸۳ھ کے درمیان قرار پاتا ہے اگر یہ قیاس کر لیا جائے کہ مرزا طاہر نے غلطی سے ظفر خاں کی "حکومت کشمیر" کی جگہ "حکومت کابل" لکھ دی تو پھر نسبتی کی وفات کم از کم ۱۰۶۲ھ اور ۱۰۷۵ھ کے درمیان واقع ہوئی ہوگی۔ مگر اس میں بھی تو اختلاف ہے کہ ظفر خاں کب فوت ہوئے۔ مولوی عبدالمقتدر ۱۰۷۳ھ۔ سراج ۱۰۸۱ھ یا ۱۰۸۳ھ اور علامہ شبلی ۱۰۷۵ھ لکھتے ہیں۔ علامہ شبلی نے ظفر خاں کا حال مآثر الامرا کے حوالہ سے لکھا ہے۔ اس لئے میں ان کا قول مرجح سمجھتا ہوں۔ پس اس عاجز کے خیال میں نسبتی کی وفات عہد عالمگیر کے ابتدائی ایام کا حادثہ ہے یعنی ۱۰۶۸ھ اور ۱۰۷۵ھ کے درمیان

مرزا صائب جب ایران گئے تو جاتے ہی دربار ایران میں ملک الشعرا بن گئے۔ ان کا مشہور شعر:

"دور دستاں را بہ احساں یاد کردن ۔۔۔۔" عہد عالمگیر میں ہندوستان آیا۔ اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ صائب

کا ایران جانا اور شعر کا بھیجنا یہ سب باتیں ایک دو سال کے اندر وقوع پذیر ہوئی ہوں گی۔ اگر "جعفر خاں" اور "ظفر خاں" کو کتابت کی غلطی کہا جائے تو نسبتی کی وفات کم از کم ۱۰۵۶ھ اور ۱۰۶۲ھ کے درمیانی سالوں میں ہوئی ہوگی۔ میرے پاس تذکرۃ الشعراء نصیر آبادی ہے نہ مآثر الامرا۔ ممکن ہے اگر ان دو کتب کا بدقت نظر مطالعہ کیا جائے اور زیادہ تفحص سے کام لیں تو کوئی صحیح تر اور مفید مطلب بات معلوم ہو سکے۔ اس بارہ میں شاہجہاں اور عالمگیر اعظم کے عہد حکومت کی تاریخی کتب سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔ آئندہ قسط میں ان کا کلام پیش کیا جائے گا

(باقی) فضل حسین تبسم

(نگار) جناب فضل حسین تبسم نے نسبتی پر یہ مقالہ لکھ کر، اس میں شک نہیں بڑا کام کیا ہے۔ اول اول جب تبسم صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ کلیات نسبتی دستیاب ہو گیا ہے، تو مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیونکہ دو چار اشعار نسبتی کے جو مجھے یاد تھے۔ اُنسے میں نے اندازہ کیا تھا کہ نسبتی کا معیار تغزل وہی ہے جو سعدی کا تھا اور یہ مسلّم ہے کہ سعدی سے بہتر غزل کسی نے نہیں کہی تبسم صاحب نے جس محنت و شوق سے اس کام کو انجام دیا ہے، اس کی داد زمانہ سے ملنا تو مشکل ہے کیونکہ فارسی کا ذوق اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے، لیکن خود تبسم صاحب کا یہ احساس کہ انھوں نے نسبتی کو دوبارہ زندہ کر دیا، بجائے خود اتنی بڑی داد ہے کہ اس سے زیادہ کی تمنا کوئی معنی نہیں رکھتی

اگر کلیات نسبتی انھوں نے میرے پاس بھیج دیا، جیسا کہ انھوں نے وعدہ کیا ہے تو میں خود بھی اختتام مقالہ پر اپنی رائے پیش کروں گا اگر اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کلیات نسبتی کا ایک نسخہ رامپور کے کتاب خانہ میں بھی ہے جس کا ذکر مولانا عرشی ناظم کتاب خانہ نے خود مجھ سے کیا تھا، اگر کبھی رامپور گیا تو دیکھوں گا کہ تبسم صاحب کے دریافت کئے ہوئے نسخے سے وہ کس حد تک مطابق ہے۔ اس مقالہ کی آئندہ قسط جس میں نسبتی کی غزلگوئی سے بحث کی گئی ہے، دیکھنے کے قابل ہوگی، کیونکہ وہی اس مضمون کی جان ہے (نیاز)

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۲۷ء۔ نومبر ۳۳ء۔ جنوری و اپریل تا دسمبر ۳۴ء۔ جون ۳۵ء۔ مئی و اگست ۳۶ء۔ فروری و ستمبر ۳۷ء کے نگار کے پرچے۔ جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں، دفتر کو اطلاع دیں۔ منیجر نگار

مکتوبات نیاز

مکرمی ۔ تسلیم ۔ عنایت نامہ پہونچا۔ معاذ اللہ! یہ تلخی و درشتی، یہ گرمی و برہمی!

اور بات ہے اتنی کہ اُدھر کل ہے اِدھر آج

میں آپ کو کیونکر باور کراؤں کہ میرا مقصود وہ نہیں تھا جو آپ سمجھے ہیں۔ قبلہ، عرض و اعتراض میں بڑا فرق ہے، لیکن مشکل تو یہی ہے کہ میرا خط میرے لب و لہجہ سے آپ کبھی پڑھتے ہی نہیں

میں تو صرف اپنے "دعوئے وارستگی" کی داد آپ سے چاہتا تھا، آپ نے اسے اپنے خلاف "فریاد" کے رنگ میں سُنا، حالانکہ میری طرح آپ بھی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ

شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

وہ شخص جس نے کبھی آپ کی "پاکدامنی" پر غلط نہ کیا ہو اسے آپ اُس کی "تردامنی" کی حکایت کیا سناتے ہیں۔

میں شکریہ کا عادی نہیں، لیکن آپ کی یہ شکایت ایسی نہیں کہ اظہارِ تشکر نہ کروں،

سنئے، اگر واقعی خدا ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ میں اسے اپنی بیچارگی ہی سے پہچاننے کی کوشش کروں اور اگر نہیں ہے تو پھر یہ "وطنِ بیکسی" کیا!

آپ کو تو خیر، اپنی پارسائی پر اتنا زعم بھی نہیں ہے، میں نے تو اُن کے ایمان کو بھی اپنے کفر سے فروتر پایا ہے، جنکے طواف کے لئے (بقول اُن کے) خود کعبہ اپنی جگہ سے چل پڑتا ہے

نگہ گرنشد قابلِ روئے دوست

فغاں می رسانم بجائے کہ اوست

یعنی اگر آپ کو دیکھنے کی فرصت زمانہ نہیں دیتا تو کم از کم "حسرتِ دیدار" تو آپ تک پہونچا ہی دوں

زچاکِ سینہ آہے می نویسم

کہ تا نم حرفِ ما سے می نویسم

کسقدر تڑپا دیں یہ سنکر کہ آپ یہاں آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ کس قدر دل دکھا دینے والی بات ہے کہ میں تو عدم حاضری کا عذر لنگ بھی پیش نہ کر سکوں اور آپ کے پاس یاد نہ کرنے کے سو بہانے موجود ہوں۔ خوش رہئے میں کیا اور میری یاد ہی کیا،

باکدا میں ذرہ بے مہر خویشتن را اعتبار
آنقدر ہیچم کہ از خود شرمسارم کردہ اند

امید بناہا، کل گرامی نامہ پہونچا اور اس میں وہ کچھ بھی پایا جس کی توقع نہ تھی، توقع کا کیا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نہ ہوں تو میری دنیا بھی خالی اور اگر دین کوئی چیز ہے تو وہ بھی خالی

میں یقیناً اس پر عمل کروں گا، جو آپ نے لکھا ہے اور نامہ و پیام نہیں بلکہ خود پہونچکر وہ سب کچھ کہوں گا جو آپ نے فرمایا ہے، لیکن یہ دیکھ لیجئے کہ اگر اس پر بھی ان کی تلخیاں دور نہ ہوئیں تو پھر میرے لئے سوائے کھلی ہوئی بغاوت کے اور کوئی راستہ نہیں رہتا

عجز و بندگی بری نہیں اگر واقعی بندہ نوازی بھی کوئی چیز ہو، ورنہ پھر سر پھوڑنے سے بہتر سرکشی ہے کہ اس طرح کم از کم اپنے متعلق تو یہ سمجھنے کا موقعہ مل جاتا ہے کہ

آئینہ برائے خود بہارے دارد

عزیز یہاں نہیں ہے، جسوقت واپس آیا، فوراً آپ کی خدمت میں روانہ کروں گا۔ یہ آپ نے کیا فرمایا۔ اس کے لئے اس سے زیادہ سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی آپ کی خدمت کے لئے وقف کر دے ـــ اس باب میں اب اور کچھ نہ لکھئے گا، میں آپ کی رکی رکی باتوں سے سمجھ گیا کہ آپ کے دل میں کیا ہے

میری حالت پہلے سے اچھی ہے، لیکن نہ اتنی اچھی کہ اس پر صحت کا اطلاق ہو سکے۔ زندگی نام ہے صحت کا اور صحت کہتے ہیں ولولہ و نشاط کو، سو جب یہی نہیں تو پھر یہ پوچھئے کہ جی کیوں رہا ہوں۔ ایام دولت مستدام!

ماشاء اللہ، کیا کہنے ہیں، اس صداقت و صفا کے۔ آپ نے دنیا میں کبھی کاہے کو جھوٹ بولا ہوگا، آپ کے اصول نے کب کسی مصلحت کو گوارا کیا ہوگا

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ "انسانیت" کا تقاضا اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے مقابلہ میں، ملازمت کے اصول و فرائض تو خیر کیا ہیں، میں شریعت و مذہب کو بھی کوئی چیز نہیں سمجھتا اگر وہ اخلاق کے منافی ہے۔ اسی لئے فرنگ کے جھگڑے میں، میں بالکل حضرات شیعہ سے متفق ہوں۔ کیسا ترکہ، کہاں کا استحقاق، کیسا اصول۔ کہاں کی فقہ، دیکھنا یہ تھا کہ

سائل کون ہے، اور کیا چیز طلب کر رہا ہے — رسول کی بیٹی کی درخواست ہے جس نے اپنی ساری عمر چکی میں پس پس کر کاٹ دی اور باغِ فدک حاصل کرنے کی درخواست ہے جس کی آمدنی شاید "بقدرِ کفاف" سے زیادہ نہ تھی، لیکن اُصولِ مذہب کو سامنے رکھ کر (اگر وہ واقعی اُصول تھے) فاطمہ کی اس التجا کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ کیا انسانیت کا تقاضہ یہی تھا اور کیا ایسی "ہادیِ انسانیت" شریعت پر عمل کرنا کسی کے لئے قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔ بعض وقت میں سوچتا ہوں کہ کہیں یہ سب کچھ اس لئے تو نہیں ہوا کہ فاطمہ علیؑ کی بیوی تھیں۔ بہرحال مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ انسان کو کبھی کبھی اُصول سے بھی ہٹ جانا چاہئے اور بقول اقبال، دل کو کبھی کبھی عقل کی گرفت سے آزاد بھی کر دینا چاہئے

میں نے مانا کہ اس نے غلطی کی اور سخت غلطی کی، لیکن آپ نے جو کچھ کیا وہ اس سے بھی زیادہ کچھ اور چیز ہے میرے پاس اس کے ظاہر کرنے کے لئے الفاظ موجود ہیں، لیکن نہیں کہتا کہ آپ اور زیادہ پریشان ہو جائیں گے

معاف فرمائیے جو کچھ میں نے لکھا اس لئے نہ تھا کہ آپ اپنے کئے کی تلافی کریں، بلکہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دنیا میں اس بات کے سمجھنے والے بھی موجود ہیں کہ "تو آں نئی کہ جفائے توانی دشمنی"

بندہ نواز،

میں تو آپ کا صرف نیاز مند ہوں — نہ کبھی اپنے دعوئے خلوص کو ذریعۂ افتخار سمجھا، نہ اخلاق گرامی کو وسیلۂ کار۔ آپ سے محبت کرتا ہوں بغیر کسی وجہ کے اور آپ کی عزت میرے دل میں ہے بغیر کسی حجت و دلیل کے۔ اگر آپ مجھ سے خفا ہیں محض اس لئے کہ میں نے کبھی نہ آپ کے لئے رسمی نمود و نمائش سے کام لیا، تو افسوس ہے کہ اس بدقسمتی کا علاج میرے پاس کوئی نہیں۔ کسقدر حیرتناک امر ہے کہ جن سے دل کو تعلق ہوتا ہے وہی دل کی باتیں نہیں سمجھتے

آپ اس جذبہ کا جو نام چاہیں رکھئے، لیکن یہ یقینی ہے کہ میں احساسِ پستی (Inferiority Complex) کا شکار نہیں ہوں۔ اور بڑی سی بڑی زبردست خواہ کتنا ہی بڑا عمامہ اس کے سر پر ہو اور کتنی ہی طویل عبا دوش سے مجھے مرعوب نہیں کر سکتی۔ اپنی عقل پر بھروسہ کرتا ہوں، ہمیشہ اسی پر اعتماد کیا ہے اور

شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اب دہلی کا آنا جانا بند ہے۔ لیکن اس دوران میں کوئی صورت وہاں جانے کی پیش آگئی تو ضرور حاضر ہوں گا لیکن آپ کے یہاں قیام کا وعدہ نہیں کرتا

کرمی — جلال آسیر بہت اچھا شاعر تھا اور عرفی، نظیری اور کلیم کی صف میں لایا جا سکتا ہے۔ غالب کو انھیں چاروں کا نچوڑ سمجھئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:—

برنمی آید دلم با روزگار — شیشۂ طاقت بہ سنداں می زنم
سینہ صافی، باغ من، بستان من — خندہ بر الفت پرستاں می زنم

مسلماں کافرم، کافر مسلماں — نہ دینم رونقے دارد نہ دنیا

اسیر از دوست پرسیدن چہ حاجت — سوالے را کہ دشنامش جواب ست

دل را در آتش افگنم و بوئے او کنم — منت نمی تواں ز نسیم و صبا کشید

از غبارِ شوق طرحِ کعبۂ دل ریختند، — گردِ رہ برداشتند و رنگِ منزل ریختند

شمع را ہمدرد بلبل کرد عشق، — برگ گل چیدند پر پروانہ ساخت

در گلستاں دیدمش نشناختم — برتنش پیراہن گل تنگ بود

لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس قسم کے اشعار جلال اسیر کے یہاں کم ہیں اور اسی لئے نہ وہ عرفی و نظیری کا ہمسر ہو سکا اور نہ ہم غالب پر اسے ترجیح دے سکتے ہیں

نگرمی ۔ خیال نہایت پاکیزہ اور اچھوتا ہے۔ بلبل و آشیاں، برق و گلچیں پر بہت توجہ صرف کی گئی اور لوگوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھکر ایسے اشعار کو جمع بھی کیا، لیکن "آئینہ" کے متعلق کوئی صورت کاوش کی اختیار نہیں کی گئی

بیشک حیرانی کا تلاذمہ تو باقی رہے گا، لیکن اس میں بھی بات پیدا کرنے والے پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ یہ موضوع بیدل کو بہت پسند تھا۔ اس سے بہتر اشعار آپ کو کسی اور جگہ نہ ملیں گے۔ اس وقت دو شعر یاد آگئے ہیں، انھیں تو سن ہی لیجئے:۔

یار در آغوش و نامِ او نمیدانم کہ چیست
سادگی ختم ست چوں آئینہ بر لبہائے ما

بدل نقشے نمی بندد کہ با وحشت نہ پیوندد
نمیدانم کدامیں بیوفا آئینہ چیدہ اینجا

باب الاستفسار

مانسون

(جناب سید خلیل احمد صاحب - چھپرہ)

مانسون (monsoon) کسے کہتے ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں مختلف مقدار بارش کی کیوں ہوتی ہے ؟

(نگار) مانسون سے مراد وہ ہوا ہے جو کسی موسم میں یکساں طور پر چلتی رہے۔ یہ ہوا خشکی و تری کی باد نسیم ہے زیادہ وسیع پیمانہ پر۔ گرمی میں زمین کا بڑا حصہ گرم ہو جاتا ہے اور یہاں کی ہوا بہ نسبت ملحقہ سمندروں کی ہوا سے زیادہ ہلکی ہو جاتی ہے، گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ خشکی پر ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور سمندر پر زیادہ اس لئے سمندر کی طرف سے خشکی کی طرف ہوا کا رُخ ہو جاتا ہے جو اپنے ساتھ سمندر کے ابخرات لاکر پانی برساتا ہے۔ جاڑوں میں صورت بالکل برعکس ہو جاتی ہے، اسی لئے اس موسم میں خشکی کے سمندر کی طرف ہوا چلتی رہتی ہے — بارش کی کمی یا زیادتی کے اسباب مختلف ہیں۔ ایک سبب زمین کی بلندی ہے۔ پہاڑ ہمیشہ ہوا کو زیادہ بلندی کی طرف مایل کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہوا پھیل کر سرد ہو جاتی ہے اور جب وہ واپس لوٹتی ہے تو نسبتاً گرم ہوتی ہے اور اس لئے کم بارش پیدا کرتی ہے۔ دوسرا سبب سمندر کا فاصلہ ہے۔ جو مقام سمندر سے زیادہ دور ہوگا اتنی ہی کم بارش وہاں ہوگی

خط استوا پر ہمیشہ زیادہ بارش ہوتی رہتی ہے کیونکہ باد موافق (Trade Wind) کی وجہ سے وہاں کی ہوائیں ہمیشہ تموج پایا جاتا ہے۔ منطقہ حارہ (Tropical) پر بہت کم بارش ہوتی ہے۔ ان مقامات پر جو زیرین منطقہ حارہ (Sub Tropical) میں ہیں، جاڑوں میں بارش ہوتی ہے جب پچھم کی ہوا ان سے گزرتی ہے۔ وہ مقامات جو زیرین منطقہ حارہ کے مشرق میں واقع ہیں وہاں گرمی میں زیادہ بارش ہوتی ہے — منطقہ معتدلہ میں ساحلی مقامات پر بارش زیادہ ہوتی ہے اور میدانی علاقوں میں کم، یہاں بارش گرمی میں زیادہ ہوتی ہے جو ہوا سمندر کی طرف سے چلتی ہے

مانسون کی زمینیں وہی کہلاتی ہیں جہاں سخت گرمی پڑنے کے بعد بارش شروع ہوتی ہے۔ شروع میں بحری و بحری باد نسیم کا ذکر کیا ہے، اسے بھی سمجھ لیجئے۔ دن کے وقت خشکی کا حصہ بہ نسبت سمندر کے زیادہ گرم ہو جاتا ہے اور وہاں کی ہوا زیادہ ہلکی ہو جاتی ہے اس لئے وہ خشکی سے سمندر کی طرف چلتی ہے۔ اس کا نام بری نسیم ہے رات کے وقت صورت برعکس ہو جاتی ہے، یعنی سمندر کی ہوا زیادہ گرم اور ہلکی ہو جاتی ہے اس لئے وہ پانی سے خشکی کی طرف جاتی ہے اور اس کا نام بحری نسیم ہے۔

مطبوعات موصولہ

اسٹینڈارڈ انگلش اُردو ڈکشنری
The Standard English-Urdu Dictionary -.

یہ وہی لغت ہے جس کا عرصہ سے ملک کو انتظار تھا اور جسکی تکمیل پر انجمن ترقی اُردو یا مولوی عبدالحق صاحب کو جتنی داد دیجائے کم ہے۔ یونتو انگریزی اُردو کی ڈکشنریاں متعدد پائی جاتی ہیں لیکن وہ یا تو اسکول کے چھوٹے بچوں کے لئے کارآمد ہیں یا ان لوگوں کے لئے جو اُردو سے واقف نہیں ہیں۔ کوئی ایسا لغت جو مصنفین و مولفین کے لئے کارآمد ہو سکتا موجود نہیں تھا۔ انجمن ترقی اُردو کے اس لغت نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے اور بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اسوقت تک اس سے زیادہ جامع و مکمل قاموس انگریزی اُردو کا کوئی شائع نہیں ہوا انگریزی زبان میں اسوقت تک جتنے جدید الفاظ کا اضافہ ہوا ہے وہ سب اس میں موجود ہیں اور اس لئے علوم و فنون کی عام و مشہور اصطلاحات بھی اس میں آگئی ہیں۔ ہر زبان میں ایک ایک لفظ کے معانی موقع و محل کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتے ہیں اور انھیں کا سمجھنا زبان جاننا ہے چنانچہ اس لغت میں انگریزی الفاظ کے جتنے مختلف معانی ہو سکتے ہیں وہ سب دیدئے گئے ہیں اور ان میں باہمد گر جو نازک فرق پایا جاتا ہے اس کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کر دیا گیا ہے۔ ایک اور خصوصیت اس لغت کی یہ ہے کہ انگریزی لفظ اور محاورہ کے لئے ایسا اُردو لفظ یا محاورہ استعمال کیا گیا ہے جو مفہوم کو صحیح طور پر ادا کر سکے، چنانچہ اس غرض کیلئے تمام اُردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات سے مدد لی گئی ہے۔ علاوہ اس کے ایسے الفاظ کے لئے جن کا مفہوم ادا کرنے کے لئے کوئی لفظ اُردو میں موجود نہ تھا، نئے مفرد و مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں جو بہت موزوں ہیں۔

یہ لغت انگریزی کے مشہور لغت آکسفورڈ ڈکشنری کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور اس ڈکشنری کا ہر لفظ خواہ مفرد ہو یا مرکب اس میں موجود ہے۔ اس لغت کو ایک کمیٹی نے مرتب کیا ہے اور اس کی ترتیب و تہذیب مولوی عبدالحق صاحب نے کی ہے کاغذ نہایت قیمتی استعمال کیا گیا ہے جسے بائبل پیپر کہتے ہیں۔ ٹائپ کی چھپائی انگریزی اُردو کی بہت صاف و روشن ہے۔ جلد بھی نہایت خوشنما و مضبوط ہے ... مولوی عبدالحق صاحب نے ابتدا میں ایک دیباچہ کے ذریعہ سے ان تمام خصوصیات کو ظاہر بھی کر دیا ہے جو اس لغت میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی لیکن اب جو اشاعت کے بعد ہم اس لغت کی خصوصیات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تعویق بالکل درست تھی اس کی قیمت سولہ روپیہ ملک کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے ضرور زیادہ ہے، کیا اچھا ہوتا اگر بالاقساط خریداری کا بھی انتظام کر دیا جاتا

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے خط و کتابت کی جائے

بھولی ہوئی باتیں

وہ دامنِ کہسار کے پُر کیف نظارے
سینے سے چٹانوں کے وہ پھوٹے ہوئے دھارے

مہتاب کی کرنوں کے وہ خاموش فسانے
وہ نیچی نگاہوں کے پُر اسرار اشارے

وہ تشنگیِ دل، وہ تقاضائے ملاقات
اور وہ مری سرشاریاں چشمے کے کنارے

وہ تیری نگاہوں سے محبت کا ترشح
جذبات کی موجوں میں جوانی کے شرارے

وہ راستہ ہموار نہ ہونے کی شکایت
وہ بیٹھنا تھک کر مرے بازو کے سہارے

آہٹ سے وہ پتوں کی ترا چونکنا جیسے
بندوق کی آواز سے ڈر جائیں چکارے

ہم عشق کی آغوش میں جب محو تھے باہم
خاتون! تجھے یاد ہے وہ وقت، وہ عالم؟

وہ مجھ کو ترا از سرِ نو ہوش میں لانا
دانستہ ترا دوشِ حسیں سے آنچل کو گرانا

وہ آنکھ بچا کر تری برجستہ شرارت
وہ کنج میں چھپ کر مجھے سایوں سے ڈرانا

وہ میری نگاہوں میں فرشتوں کا تقدس
وہ تیرے لبِ ناز پہ حوروں کا ترانا

وہ ڈوبی ہوئی کیفِ محبت میں جوانی
مجروح وہ ٹھوکر ہے تری فرقِ زمانا

وادی میں درختوں سے اُلجھتا ہوا بادل
وہ جھیل کی موجوں پہ ترا تان اُڑانا

ہم عشق کی آغوش میں جب محو تھے باہم
خاتون! تجھے یاد ہے وہ وقت، وہ عالم؟

فضل الدین اثر ایم۔ اے

غزل:

سیماب اکبر آبادی

طولِ رہِ حیات سے گھبرا رہا ہوں میں
گھبرا رہا ہوں اور چلا جا رہا ہوں میں

چھوتی نہیں مجھے پرِ جبریل کی ہوا
یہ کن بلندیوں پہ اُڑا جا رہا ہوں میں

تیری صدا پہ کان، زباں تیری ترجمان
جو گیت سُن رہا ہوں وہی گا رہا ہوں میں

کچھ یوں بھی ہے کہ فطرتِ غم ہے سکوں پسند
کچھ یہ بھی ہے کہ خبط کیے جا رہا ہوں میں

آ، اور دیکھ محویتِ بیخودی مری
تجھ سے بھی بے نیاز ہوا جا رہا ہوں میں

منظور ہے مجھے شکستِ حُسن سے شکست
لے آج تجھ میں جذب ہوا جا رہا ہوں میں

اُٹھتا ہوں میکدے سے، اور آج اپنے ساتھ ہی
جامِ و شراب کو بھی لیے جا رہا ہوں میں

کیوں میرے ترکِ بادہ پہ تجھ کو یقیں نہیں
ساقی ترے لبوں کی قسم کھا رہا ہوں میں

سیمابؔ کس نے عرش سے آواز دی مجھے؟
کہہ دو کہ انتظار کرے، آ رہا ہوں میں

مشترک ہندوستانی زبان کا نمونہ

جس کی سفارش کانگریس ہائی کمانڈ نے کی ہے

مولانا ابوالکلام آزاد دوادویں

شکشا۔ سنگھٹن ہمت کے سمکش

سنکٹ پرانت کے شکشا سچیو

مانئے شری سمپورنانند جی کا ویاکھیان

(پرکاشن وبھاگ، سنیکت پرانتیے گورنمنٹ)

آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک بشیشتا ہے کہ شکشن شمیا کے پرتی لوگوں کا آگرہ شٹر بہت ویشدہ اور بیاپک ہوگیا ہے۔ یہ بات آدھکانش بستیے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور تل ن سمار ہم اپنے دیش میں بھی اس بشیشو یاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا اک بھو کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس مانسک اور کل ہار تک پرستھتیوں میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھت کا جو سماجک راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پورووجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشیو ویاپی پرگت کو ہمارے سملکھ ونش سندیہ ایک بشیس روپ میں اپستھت کیا ہے اور ایک وشیس بھارتیے سمسیہ بنا دیا ہے

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ دیوالی کی رات میں بیر جگانے کا کوئی منتر نہیں ہے بلکہ ترجمہ ہے آنریبل سری سمپورنانند جی وزیر تعلیمات کے ایک حصہ تقریر کا جسے محکمہ اطلاعات یوپی گورنمنٹ نے شائع کیا ہے۔

(ایڈیٹر)

امامیہ مشن کے رسالے

نمبر شمار	نام رسالہ	قیمت	محصول
۱	قاتلانِ حسین کا مذہب	۰۴ر	۱ر
۲	تحریف قرآن کی حقیقت تیسرا ایڈیشن زیر طبع	—	—
۳	مولود کعبہ (ختم)	—	—
۴	وجودِ حجت	۰۴ر	۱ر
۵	اصولِ دین اور قرآن	۰۴ر	۱ر
۶	اتحاد الفریقین حصہ اول	۰۴ر	۱ر
۷	حسین اور اسلام (اردو)	۰۱ر	۰ر
۸	" " (ہندی)	۱ر	۰ر
۹	" " (انگریزی ختم)	—	—
۱۰	متعہ اور اسلام	۹ر	۱ر
۱۱	امامت ائمہ اثنا عشر اور قرآن	۰ر	۰ر
۱۲	تجارت اور اسلام (ختم)	۳ر	۱ر
۱۳	اتحاد الفریقین حصہ دوم (ختم)	۰۴ر	۱ر
۱۴	علی اور کعبہ (ختم)	۱ر	۰ر
۱۵	رجال بخاری حصہ اول	۰۶ر	۰۱ر
۱۶	مذہب بابی بہا حصہ اول	۰۵ر	۱ر
۱۷	نوروز و غدیر	۱ر	۰ر
۱۸	محاربۂ کربلا	۲ر	۰ر
۱۹	کربلا کا آنکھوں دیکھا بیان (ہندی ختم)	—	—
۲۰	دی مارٹرڈم آف حسین (انگریزی)	۲ر	۰ر
۲۱	اسوۂ حسینی	۰۷ر	۱۰ر
۲۲	جنگ صفین	۳ر	۰ر
۲۳	تذکرۂ حفاظ شیعہ حصہ اول	۰۶ر	۱۰ر
۲۴	" " حصہ دوم	۰۵ر	۱ر
۲۵	مقصود کعبہ	۱ر	۰ر
۲۶	مذہب بابی بہا حصہ دوم	۹ر	۱۰ر
۲۷	مذہب اور سائنس	۱ر	۰ر
۲۸	معرکۂ کربلا (ختم)	۲ر	۰ر
۲۹	کربلا کا مہابودھ "	۲ر	۰ر
۳۰	دی ٹریجڈی آف کربلا (انگریزی)	۲ر	۰ر
۳۱	اسلام کی جیکیانہ زندگی	۹ر	۱۰ر
۳۲	دور استبداد	۰۴ر	۱ر
۳۳	حقیقت بداء	۲ر	۰ر
۳۴	خطیب آلِ محمد	۰۴ر	۱ر
۳۵	تدوین حدیث	۱ر	۰ر
۳۶	مطلوب کعبہ	۱ر	۰ر
۳۷	محاربۂ کربلا	۰۲ر	۰ر
۳۸	اسلام کا پیغام (اردو)	۰ر	۰ر
۳۹	دی میسج آف اسلام (انگریزی)	۰ر	۰ر
۴۰	اثبات عزاداری	۰۴ر	۱ر
۴۱	مسئلۂ فدک	۰۵ر	۱ر
۴۲	تاجدار کعبہ	۱ر	۰ر
۴۳	خلافت و امامت حصہ اول	۰۵ر	۱ر
۴۴	" " حصہ دوم	۰۴ر	۱ر
۴۵	" " حصہ سوم	۰۴ر	۱ر
۴۶	تحقیق اذان	۱ر	۰ر
۴۷	ذوالجناح	۰ر	۰ر
۴۸	شہدائے کربلا	۰۴ر	۱ر
۴۹	کربلا کا مہاسمر (ہندی)	۲ر	۰ر
۵۰	حسین ان دی پلیین آف کربلا (انگریزی)	۰۱ر	۰ر
۵۱	مشہد اعظم	۱ر	۰ر
۵۲	لاتفسدوا فی الارض	۰۸ر	۱۰ر
۵۳	نہج البلاغہ کا استناد	۰۴ر	۱ر
۵۴	خلافت و امامت حصہ چہارم	۰۳ر	۱ر
۵۵	شہدائے کربلا حصہ دوم	۰۵ر	۱ر
۵۶	ابوالائمہ کی تعلیمات	۰۴ر	۱ر
۵۷	حسین کا پیغام عالم انسانیت کے نام	۱ر	۰ر
۵۸	اسلامی عقاید	۲ر	۰ر
۵۹	آثار باقیہ (زیر طبع)	—	—
۶۰	صحیفۂ سجادیہ کی عظمت (زیر طبع)	—	—

کتب امامیہ بک ایجنسی

۱	حسین دی مارٹر (انگریزی)	۱۲ر	۰۲ر	۶	وجیزۃ الاحکام	۰۴ر	۱	۱۱	ڈرم نزم ٹیچنگز آف محمد (انگریزی)	۰۶ر
۲	الشہید (اردو)	۱۰ر	۰۱ر	۷	صحیفۂ تجلی (رباعیات)	۰۸ر	۰۱ر	۱۲	تاریخ ازدواج	۰۸ر
۳	کائنات قبل از اسلام	۰۴ر	۰ر	۸	رسول کی بیٹی	۰۲ر	۰ر	۱۳	الہامی حکمات	۰۳ر
۴	قاتلانِ حسین کی گرفتاری	۰۸ر	۰۲ر	۹	گلِ عصمت	۰۱ر	۰ر	۱۴	شہید اسلام	۰۶ر
۵	حج و بینات	۰۶ر	۰۲ر	۱۰	رجال بخاری حصہ دوم	۰۶ر	۰۱ر			

ملنے کا پتہ:- آنریری سکریٹری امامیہ مشن ٹرسٹ بورڈ۔ لکھنؤ